پاکستان میں
صحافت کی متبادل تاریخ

December 25, 1958 17 R

When the truth cannot
be freely spoken, and
patriotism is held almost
a crime, this editorial
space is left blank on
the Quaid-i-Azam's
birthday, to speak more
eloquently than words.

ڈاکٹر توصیف احمد خان

پاکستان میں
صحافت کی متبادل تاریخ

تحقیق و تحریر

ڈاکٹر توصیف احمد خان

بدلتی دنیا پبلی کیشنز

مکان نمبر 133، گلی نمبر 8، سیکٹر F-11/1 اسلام آباد

0333-5577993

کتاب کا نام : پاکستان میں صحافت کی متبادل تاریخ
تحقیق و تحریر : ڈاکٹر توصیف احمد خان
سابق سربراہ، شعبہ ابلاغیات، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی
اہتمام : ایوب ملک
زیرنگرانی : مظہر عارف، ایگزیکٹو ڈائریکٹر (SAMAR)
ایڈیٹنگ : ارشد رضوی
زیراہتمام : سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ (SAMAR)
اشاعت : مئی 2019
طباعت : محمود پرنٹرز، گوالمنڈی راولپنڈی
سرورق : 25 دسمبر 1958 کو قائداعظم محمد علی جناح کے یوم پیدائش کے موقع پر روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر کا ایوب مارشل لاء کے خلاف اداریہ کے بجائے ایڈیٹر کے قلم سے لکھے گئے احتجاجی نوٹ کا عکس۔

ISBN: 978-969-7753-17-8

Rs. 600/- $ 25/-

ادارہ ایسی کتب کی اشاعت کرتا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اشاعتِ کتب کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ضرر رسانی نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے اُس میں اُس کی اپنی تحقیق اور خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط برتی گئی ہے۔ بشری تقاضوں اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کر دیا جائے گا۔ (ادارہ)

بدلتی دنیا پبلی کیشنز
مکان نمبر 133، گلی نمبر 8، سیکٹر F-11/1 اسلام آباد
0333-5577993

انتساب

اُن تمام مدیروں اور صحافیوں

کے نام

جنہوں نے آزادیٔ صحافت و جمہوریت کی

علمبرداری کیلئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

Society for
Alternative media
and Research



OPEN SOCIETY
FOUNDATIONS

Office # 33, First Floor, Al-Anayat Mall,
G-11 Markaz, Islamabad. Pakistan
+ 92-51-236 3633/55
www.alternativemedia.org.pk

ترتیب

اظہارِ تشکر

سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ (SAMAR) میڈیا میں شائع ہونے اور نشر ہونے والے مواد سے غیر مطمئن اور نالاں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میڈیا کو آزاد، غیر جانب دار اور ذمہ دار ہونا چاہیے اور معاشرے کے ہر طبقے اور مختلف وفاقی اکائیوں کی بات بلا امتیاز کرنی چاہیے جبکہ پاکستان کا غالب میڈیا ان خواص سے عاری ہے۔ SAMAR اس حوالے سے تقریباً دو دہائیوں سے کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں اس ادارے کے زیرِ انتظام و زیرِ اہتمام ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں پاکستان میں جمہوریت کے قیام و بقاء کیلئے مختلف ادوار میں صحافتی اداروں اور افراد کی جدوجہد کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب منفرد حیثیت اختیار کر گئی ہے اور شعبہء صحافت سے منسلک افراد اور اداروں کیلئے حوالہ جاتی کتاب (Reference Book) کا درجہ رکھتی ہے۔

'بدلتی دنیا پبلی کیشنز' ایسی کتابیں شائع کرتا ہے جو اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہوں۔ SAMAR کی یہ کتاب 'پاکستان میں صحافت کی متبادل تاریخ' ایسی ہی ایک کتاب ہے جو ڈاکٹر توصیف احمد خان، سابق سربراہ شعبہ ابلاغیات، وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔

'بدلتی دنیا پبلی کیشنز' نے SAMAR کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر جناب مظہر عارف سے جو کہ شعبہء صحافت کا ایک معتبر حوالہ ہیں اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کیلئے ڈاکٹر توصیف احمد خان کے توسط سے رابطہ کیا۔

ابتدائیہ

سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مظہر عارف کہنہ مشق صحافی، دانشور اور رائٹس ایکٹیوسٹ ہیں۔ آج کل میڈیا کی مانیٹرنگ کے کام میں مصروف ہیں۔ انہوں نے نہ جانے کیوں مجھے اس کتاب کو تحریر کرنے کے لیے منتخب کیا۔ میں نے اس اہم موضوع پر ایک ناقص کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں آئی اے رحمٰن، حسین نقی، مسعود اشعر، ڈاکٹر سیمی نغمانہ، ضیاء الدین، فریدہ حفیظ، وہاب صدیقی، عابد علی سید، ناصر زیدی، ڈاکٹر جبار خٹک، ڈاکٹر ریاض شیخ، طاہر نجمی، بدر عالم اور ارشد رضوی نے بھرپور تعاون کیا۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد نے قیمتی دستاویزات عنایت کیں۔ ڈاکٹر انور شاہین نے پاکستان اسٹڈی سینٹر کی لائبریری سے کتابیں فراہم کیں۔ ڈاکٹر طاہر مسعود نے اپنی ذاتی لائبریری سے کتابیں عنایت کیں۔ ایوب ملک اگر مجھے بنیادی سہولتیں فراہم نہ کرتے تو یہ ہدف مکمل نہ ہوتا۔ ڈاکٹر عرفان عزیز نے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے قدیم اخبارات اور تراشے میری میز تک پہنچائے۔ پروفیسر مسعود احمد نے اپنے قیمتی وقت میں سے بہت سا وقت ترجمے کے لیے وقف کیا۔ عابد علی سید، ظفر عباس، طاہر نجمی، ڈاکٹر جبار خٹک، مظہر عباس اور طاہر ایچ خان نے مشکل مراحل کو آسان کرنے میں مدد دی۔ پیرزادہ سلمان نے روزنامہ ڈان کی لائبریری تک رسائی کو ممکن بنایا۔ خرم مشتاق نے ایک دفعہ پھر اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈالتے ہوئے میری خستہ تحریروں اور نہ پڑھے جانے والے اخباری تراشوں کو کمپیوٹر پر منتقل کیا۔ یاسمین عابد نے کینسر سے لڑائی کرتے ہوئے میرے لیے دعاؤں کے لیے وقت نکالا۔ پروفیسر ناصر عباس، پروفیسر شاہین اختر، پروفیسر سعید عثمانی، ڈاکٹر آزادی فتح برفت، طاہرہ طارق، ناصر محمود، فلک ناز، اشرف خان اور سیف اللہ کی مدد کے بغیر، زندگی کا کوئی کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ سینئر صحافی رشید بٹ نے صحافتی

دنیا کے کئی اہم واقعات سے آگہی دی۔ حفیظ بزدار نے HRCP کی لائبریری سے اخبارات و رسائل فراہم کئے۔ میری اہلیہ فرزانہ یاسمین نے ہمیشہ کی طرح مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے دور رکھ کر اطمینان سے کام کا موقع دیا۔ میرے بچوں ارباز خان اور ڈاکٹر سندس نے اپنے اپنے کاموں پر توجہ دے کر مجھے ذہنی سکون دیا۔

توصیف احمد خان

پیش لفظ

مظہر عارف

ایگزیکٹوڈائریکٹر

گزشتہ برس کراچی میں قیام کے دوران ہیرالڈ کے ایڈیٹر جناب بدر عالم سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ میرے ساتھی ارشد رضوی صاحب اور میں ان سے صحافت کے تاریخی کردار کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں اخبارات نے جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کے نفاذ کے لیے تاریخی جدوجہد کی۔ اس جدوجہد میں صحافیوں اور ایڈیٹروں کی گرفتاریاں، اخبارات کی بندش، اخبارات پر ریاستی قبضے، اخبارات کے نئے ڈیکلریشن کے اجراء پر پابندیاں، نیوز پرنٹ اور سرکاری اشتہارات کی عدم فراہمی اور پریس ایڈوائس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں کا دباؤ جیسے مسائل شامل تھے، مگر اخباری اداروں، مدیروں اور صحافیوں کے اس کردار کو کہیں جامع طور پر قلمبند نہیں کیا گیا۔ نوجوان صحافی اور صحافت کے طالب علم صحافت کی اس مزاحمتی تاریخ سے واقف نہیں۔ آج کی صحافتی صورتحال میں اس تاریخ کو رقم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ہم نے بدر عالم کے ''صحافت کی متبادل تاریخ'' (Archiving History of alternative media) کے آئیڈیاز کو عملی شکل دینے کی کوشش کی ہے اور اداریوں، کالموں اور مضامین کو ایک کتاب میں، جہاں تک ہوسکا، جمع کیا ہے۔

اس کتاب میں ان چیدہ چیدہ اخبارات کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے جن اخبارات نے فوجی آمریتوں کے خلاف آواز بلند کی اور مظلوم طبقات کے حقوق کے لیے آگہی پیدا کرنے کے فریضے کو اپنی ادارتی پالیسی میں اوّلیت دی۔

ہمیں امید ہے کہ قاری کو اس کتاب کے مطالعے سے پاکستان میں جمہوریت کے نفاذ میں اخبارات کے کردار کے بارے میں کچھ مواد میسر آسکے گا۔ ہم ڈاکٹر توصیف احمد خان کے شکر گزار ہیں جنہوں نے عرق ریزی سے یہ کتاب مرتب کی۔ ہم اوپن سوسائٹی فاؤنڈیشنز کے بھی شکر گزار ہیں جن کے مالی تعاون سے کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

آئینہ کیا مجال ہے تجھے منہ دکھا سکے

پاکستانی صحافت اور سماجی ارتقا

ایوب ملک
صدر نیشنل پارٹی پنجاب
کالم نگار روزنامہ جنگ

آج کے دانشور کی ذمہ داری ہے کہ وہ پھر سے سماج کو وہ توانائی فراہم کرے جس سے ہمارا سماج، صحافتی ارتقاء کے جس مرحلے پر آج رکا ہوا ہے وہاں سے دوبارہ ارتقا پزیر ہو اور یورپین صحافت کی طرح معاشرے کو حقیقی آئینہ دکھا سکے تا کہ جمہوریت کے ثمرات عوام تک منتقل ہو سکیں ۔آج اخبارات کے مالکان اپنی کاروباری مجبوریوں کی وجہ سے ریاستی اشاروں پر چل رہے ہیں جس نے آزادیِ صحافت پر وہ قدغنیں لگادی ہیں جس سے نہ صرف یہ ادارہ اپنا تاریخی کردار ادا نہیں کر پا رہا بلکہ جمہوری ادارے بھی نئی روایات بنانے سے قاصر ہیں۔پاکستانی معاشرہ آج جس دوراہے پر کھڑا ہے اسے آگے بڑھانے اور وقت کا ساتھ دینے کے لیے ایسی پسماندہ روایات سے چھٹکارہ پانا ہوگا۔اس کے لیے ذہن کو کھولنا ہوگا تا کہ تبدیلی کو قبول کیا جا سکے جس کے لیے ہمیں اپنی روایات اور ایسے اداروں کو قربان کرنا ہوگا جو ارتقاء کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔روایات اور ادارے معاشروں کے لیے ہوتے ہیں جو انسانی ضروریات کے تحت بدلتے رہتے ہیں۔تاریخ شائد ہے کہ میڈیا اور صحافی حضرات اس سماجی تبدیلی کے سب سے بڑے محرک ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر توصیف احمد خان کی زیرِ نظر کتاب پاکستان میں صحافت کے موضوع پر تحریر کی گئی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ایک ایسے معاشرے میں جہاں ریاست نے خود کو نظریاتی قرار دیا ہو وہاں دانشوروں اور صحافیوں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے تا کہ وہ معاشرے کو ہر

وقت آئینہ دکھا سکیں۔ وہ ملک میں پیش آنے والے قدرتی، سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی حالات و معاملات پر روزانہ خبریں، تجزیے، مضامین اور اداریے شائع کرتے رہیں تا کہ عوام کو ملکی حالات کے بارے میں حقائق اور ان کا تجزیہ ملتا رہے۔ لیکن پچھلے ستر سالوں سے ہم نے دیکھا ہے کہ اس اہم ادارے کو بھی وقفے وقفے سے آئینہ دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ اس ادارے کی ساکھ کے ساتھ ساتھ عوامی مفاد، جمہوریت، قانون کی پاسداری اور حکمرانوں کے احتساب کے فلسفے کو اولین حیثیت حاصل ہو۔ وہ اپنے ذاتی و کاروباری مفادات و ترغیبات کا شکار نہ ہو جائیں اور اپنے پیشہ وارانہ اصولوں کی پاسداری کریں۔ ملکی حالات کا غیر جانبدارانہ اور حقیقی جائزہ پیش کریں تا کہ صحافت کے طالب علموں، محققین اور سول سوسائٹی کے لیے قابل اعتماد اور درست حقائق پر مبنی مواد دستیاب ہو۔ انہی اصولوں کو واضح کرنے کے لیے ادارہ بدلتی دنیا نے ڈاکٹر توصیف احمد خان کی کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

آج اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ، اس کتاب میں خصوصی طور پر ان اخبارات کا ذکر شامل کیا گیا ہے جنھوں نے فوجی حکومتوں کی مخالفت کی اور جابر حکمرانوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ ان اخبارات میں سے بیشتر اخباروں نے اُس حکومت کی سختیوں اور سزاؤں کا سامنا کیا کیونکہ وہ عوام کو حقائق بتانا چاہتے تھے۔ ایسے اخباروں میں روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز، روزنامہ آزاد و ہفت روزہ معیار اور دیگر کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں شامل ہے۔

آج جب ہم یورپی سماج کا تاریخی جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جن قوتوں نے یورپ کو پسماندگی سے نکالا اس میں صحافت کا بہت اہم رول تھا۔ انہوں نے معاشرے کے جمود کو توڑنے میں مدد کی اگرچہ اس کوشش میں ان لوگوں نے اپنی جانیں بھی قربان کیں مگر ان کی قربانیوں کی بدولت آج یورپ میں جمہوریت مستحکم ہو چکی ہے اور بدعنوانی پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا ہے جس میں میڈیا اور صحافت کا بہت بڑا کردار ہے۔

یاد رہے کہ جمہوری عمل کو سماجی ترقی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کے ساتھ

باقی عوامل کا بھی ایک خاص نہج تک پہنچنا ضروری ہے۔ سماج میں موجود ساری قوتیں جمہوری عمل کے استحکام کے لیے مسلسل کام کریں تو سماج میں اس عمل کے ثمرات معاشرے تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے پاکستانی جمہوریت کی آبیاری کے لیے ضروری ہے کہ ریاست اور اس میں رہنے والے عوام کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہو اور اس رشتے کی مضبوطی کا دارومدار دوسرے اداروں کے کردار کے ساتھ ساتھ اس بات میں بھی مضمر ہے کہ پاکستان میں صحافت کا ادارہ نہ صرف آزاد ہو بلکہ اپنے آپ کو آئینے میں بار بار دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

رکھتا ہے کون خود سے حریفانہ کشمکش
میں تھا کہ رات اپنے مقابل ہی ڈٹ گیا

ہم پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر پہلے سے موجود دستیاب مواد میں گراں قدر اضافے کا سبب بنے گی اور باشعور طبقہ اس سے استفادہ حاصل کرے گا۔

ڈاکٹر عرفان عزیز

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ابلاغ عامہ

وفاقی اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر توصیف احمد خان کی تحریر 'صحافت کی متبادل تاریخ' پاکستان کے سیاسی حالات کے تناظر میں تحریر کی جانے والی بہترین کتاب ہے۔

یہ کتاب صحافت، میڈیا، سیاست اور متعلقہ مضامین کے طالب علموں اور اساتذہ کے لیے لازمی مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان میں صحافت پر ایسی کتابیں کم شائع ہوئی ہیں جو سیاسی حالات کے درست تناظر میں اخبارات کی کہانی بیان کریں۔ اخبارات درپیش سیاسی حالات میں دلچسپ اور اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ حکمران اور طاقت ور طبقات اپنی کہانی ہر حالت میں مثبت انداز میں عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف اخبار کے مدیر، رپورٹر اور کالم نگار لوگوں کے مسائل اور اپنے مشاہدات عوام کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ملک میں عوامی سطح پر بحث ومباحثہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی بحث ومباحثہ کی روشنی میں سیاست اپنی سمت کا تعین کرتی ہے اور اپنے وقت کے بڑے بڑے فیصلے گھڑیوں میں ہو جاتے ہیں۔

کتاب کے چند حصے ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر یکسر اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ آج سے ۵۰ سال قبل لکھے گئے ہوں گے۔ ملک کے طاقتور حلقوں میں آزادی اظہار اس وقت بھی اتنی ہی ناقابل برداشت تھی جتنی کہ آج ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اتنے سالوں میں نہ تو جابر حکمرانوں کی سوچ میں تبدیلی آئی ہے اور نہ ہی کچھ کنگلے صحافی آج بھی سُدھر سکے ہیں۔ جس طرح اُس وقت یہ بے یار و مددگار ہاتھوں میں قلم اور ذہنوں میں سوال اٹھائے، اپنے زمانے کے طالع آزماؤں کے

سامنے جا کھڑے ہوتے تھے اسی طرح آج بھی یہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے یکساں عزت نفس، قانون علاج، تعلیم اور غذا کی بات کرتے نہیں تھکتے۔

انسانوں کی طرح اخبارات کی بھی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ کچھ اخبار بڑے حوصلہ مند ہوتے ہیں لیکن ان کی زندگی مختصر ہوتی ہے اور کچھ طویل عمر پا جاتے ہیں اور شہرت بھی۔ کچھ بہت بہادری اور بے باکی سے اپنی بات کہنے کے عادی ہوتے ہیں تو کچھ وقت کے حاکم کے اشارے کے منتظر۔ ڈاکٹر توصیف احمد خان نے اس کتاب میں ایسے چند اخبارات اور صحافیوں کی کہانیاں پیش کی ہیں جنہوں نے درپیش حالات میں اپنا کردار بخوبی ادا کیا۔ ان اخبارات اور صحافیوں نے اپنے دور میں مشکل حالات کے باوجود پوری آواز اور سچائی کے ساتھ جبر کا سامنا کیا۔ ان ہی کی بدولت ملک میں صحافیوں کی عزت نفس قائم ہو سکی اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں آزادی صحافت کی ضمانت دی گئی۔ آج جو صحافی پورے حوصلے کے ساتھ سچائی کے لیے آواز اٹھاتے ہیں وہ ماضی میں ان ہی اخبارات اور صحافیوں کی آواز کا تسلسل ہیں۔ ملک میں صحافیوں نے آزادی اظہار کے لیے طویل اور کٹھن حالات کا مقابلہ کیا ہے، فوجی اور سول جابر حکمرانوں سے سزائیں پائی ہیں۔ ان لوگوں نے عوام تک سچ بات پہنچتی رہے اس لئے؛ اپنی زندگی کا سکھ، چین اور آرام قربان کیا ہے۔ صحافت کی متبادل تاریخ جانے بغیر مستقبل کے صحافی اپنے آپ کو تنہا، بے بس اور بے بنیاد تصور کریں گے۔ صحافت کے طالب علموں کے لیے اس کتاب کو لازمی قرار دیا جانا چاہیے اور نوجوان صحافیوں کو یہ کتاب ہمیشہ اپنے ڈیسک پر رکھنی چاہیے!

ڈاکٹر ریاض شیخ

ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنس اینڈ ایجوکیشن

شہید ذوالفقار علی بھٹو انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (زیبسٹ)

نامور جرمن مارکسی فلسفی جرگن ہیبر ماس اپنی مشہور زمانہ کتاب The Structural Transformation of the Public Sphere میں An Inquiry into a category of Bourgeon Society میں لکھتے ہیں کہ برطانیہ میں 6-1694 کے دوران تین اہم فیصلے ہوئے جنہوں نے وہاں حکومتی نظام (Governance) بہتر کرنے اور وہاں جمہوری عمل کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان تینوں فیصلوں میں سب سے اہم فیصلہ پریس پر سے سنسر شپ کے خاتمے کا تھا۔ اس کے نتیجے میں عام شہریوں تک حکومتی اقدامات تک رسائی ملی اور انہوں نے حکومت کے غلط فیصلوں پر تنقید شروع کی جس کے نتیجے میں حکومت کو اپنے فیصلوں کی اصلاح کرنے کا موقع ملا۔

اسی طرح برطانہ کے ایک اور دانشور بینڈ ڈٹ اینڈرسن اپنی تصنیف Imagined Communities میں لکھتے ہیں کہ موجودہ جدید قومی ریاست کی تشکیل کے پس پشت سب سے اہم عنصر پریس تھا۔ پریس کے ذریعے لوگوں اور قوموں میں اپنی شناخت کا تصور ابھرا اور جدید ریاست کے خدوخال واضح ہو گئے۔ ان دو مثالوں سے ایک آزاد پریس اور صحافت کی اہمیت کو بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے یہاں طویل عرصے تک فوجی آمروں کے زیر اثر جہاں ریاست کے دیگر اداروں تک تنزلی کی گئی وہیں ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت عوام کی آزادیٔ اظہار پر بڑی

بے دردی سے شب خون مارا گیا اور اس کا سب سے بڑا نشانہ اخبارات اور پریس بنے۔ ڈاکٹر توصیف احمد خان کی یہ کتاب اسی دردناک تاریخ کو رقم کرنے کی ایک کاوش ہے۔ پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار کے خلاف شروع ہونے والی کارروائی سے لے کر آج تک پاکستان میں صحافت پر پابندیوں کی ایک طویل تاریخ ہے۔ صحافی آج بھی جس مشکل میں اپنی صحافتی ذمہ داریاں ادا کررہے ہیں اس کا بیان بڑا مشکل ہے۔ ''اصل'' حکمران طبقہ (Defacto Rulling Class) عوامی شعور سے ہمیشہ خائف رہا ہے۔ دنیا آج جب Right to Information کے عہد میں داخل ہوچکی ہے لیکن ہم اب تک اپنے فرسودہ ہتھکنڈوں کے ذریعے آزادیٔ اظہار کے قتل میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر توصیف احمد خان کی یہ کتاب حکمران طبقوں، ان کے حواریوں اور حمایتیوں کی طرف سے صحافت کے خلاف اٹھائے جانے والے اقدامات کی کچھ جھلکیاں دکھاتی ہے۔ یہ کتاب صحافت کے شعبہ میں داخل ہونے والے نئے صحافیوں کو پاکستان میں اظہارِ آزادی کے تحفظ کی قربانیاں دینے والے صحافیوں اور صحافتی شعبہ سے وابستہ کارکنوں سے متعلق معلومات فراہم کرے گی وہیں ان نوجوان صحافیوں کو یہ حوصلہ بھی ملے گا کہ یہ ایک طویل لڑائی ہے اور ہمیں عوام کے آزادیٔ رائے کے تحفظ کے لیے اب اور لڑنا ہے اور اس حق کو اپنی لڑائی کے ذریعے حاصل کرکے رہنا ہے۔

پاکستان میں صحافت کی متبادل تاریخ

مظہر عباس
سابق سیکریٹری جنرل پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس
اینکر پرسن

وہ کتاب جو سب کو پڑھنی چاہیے!

کتاب کے مصنف ڈاکٹر توصیف احمد خان کا میں شکر گزار جن کی بدولت ایک معیاری کتاب مجھے پڑھنے کو ملی۔ گو کہ یہ کتاب صحافت پر ہے مگر اسے ہر سیاسی کارکن اور قائدین کو بھی پڑھنا چاہیے تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ اس ملک میں سیاسی اور شہری آزادیوں کے لیے میڈیا نے کیسی جدوجہد کی، کس پائے کے مدیر اور صحافی ہوا کرتے تھے، کن کن بندشوں سے ہو کر آج ہم اس مقام پر پہنچے ہیں کہ لوگوں کو خبر سیکنڈ میں نہیں تو منٹ میں ضرور پتہ چل جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ان تمام مدیروں اور صحافیوں کے نام کی گئی ہے جنہوں نے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک آزادیٔ صحافت اور جمہوریت کی علمبرداری کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ یہ ایک غیر معمولی سفر کی داستان ہے۔ ایسے ملک کی جہاں آزادیٔ اظہار کو ناممکن بنا دیا گیا تھا۔

میرا تعلق اس نسل سے ہے جس نے سخت سنسر شپ کے زمانے میں صحافت میں قدم رکھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں بہت پیسہ نہیں مگر عزت بہت ہے۔ ان 36 برسوں میں

پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا دونوں کا تجربہ ہوگیا۔ گو صحافت میں آنے سے پہلے بھی اخبارات اور رسائل پڑھنے کا شوق تھا۔ پہلے اخبارات پر پابندیوں کے باوجود بھی لوگ باخبر رہتے تھے اور آج میڈیا کی آزادی کے باوجود بھی لوگ بے خبر نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کا تعلق صحافت کے اس پہلو سے ہے جہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ جن اخبارات اور رسائل کو مارشل لاء کے دور میں شدید مشکلات کا سامنا رہا۔ کچھ کا ذکر رہ گیا ہے جو امید ہے دوسرے ایڈیشن میں شامل کرلی جائیں گی۔ ڈاکٹر توصیف احمد خان اگر تھوڑی اور محنت کریں تو ایک کتاب ان مدیروں اور اخبارات اور رسائل پر لکھیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ آمریت کی حمایت کی اور آزادیٔ اظہار کے خلاف لکھا۔

جن اخبارات کا ذکر غالباً رہ گیا ان میں سے سب سے اہم ''دی مسلم''، ''فرنٹیئر پوسٹ'' اور ''ڈیلی ٹائمز'' ہیں۔ پاکستان میں اچھی اور معیاری صحافت کو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ختم کیا گیا اور یہ سلسلہ ایوب خان کے دور سے شروع ہوا جس کا ذکر ہمیں اس کتاب میں ملتا ہے۔ ان کے دور میں غالباً سب سے زیادہ پریس مخالف قوانین آئے تاکہ آزاد میڈیا کو کنٹرول کیا جاسکے۔ جن مدیروں اور صحافیوں نے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا ان کو شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ تو خود استعفیٰ دے کر گھر چلے گئے اور کچھ انتظامیہ نے سرکاری دباؤ میں آکر نوکری سے فارغ کردیئے۔ بدقسمتی سے جمہوری ادوار بھی صحافت کے حوالے سے جمہوری نہیں رہے۔

صحافت پر مسلسل پابندیوں کی وجہ سے اور آمرانہ اقدامات کی وجہ سے جناب ایم اے شکور جیسے لوگوں کو ملک چھوڑنا پڑا۔ نثار عثمانی مرحوم کی شکل میں صحافیوں کو ایک ایسا رہنما بھی ملا جسے دیکھ کر اور ان کے ساتھ کام کر کے اندازہ ہوا کہ پروفیشنل کام اور یونین کا کام ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے۔ وہ پاکستان کے حسرت موہانی تھے۔ قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی تو مشقت بھی کی۔

جن مدیروں اور صحافیوں کا نام اور ان کے تحریر کیے ہوئے اداریوں کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے ان کی قابلیت اور کردار پر کوئی سوال نہیں اٹھ سکتا۔ چونکہ ہر دور میں ابن الوقت صحافیوں کی بھی ایک کھیپ موجود رہی ہے تو ہمیں معیاری اور غیر معیاری صحافت کا بھی اندازہ ہو گیا۔

بہت برسوں پہلے حیدر آباد میں صحافی اور دانشور سید نایاب حسین مرحوم کے گھر پر مجھے ہفت روزہ ڈان کی کچھ کاپیوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اب یہ یاد نہیں کہ ڈان ہفت روزہ 1951ء میں شروع ہوا یا 1938ء میں۔ ڈان غالباً پاکستان کا واحد اخبار ہے جو ہمیشہ سے کچھ بنیادی اصولوں پر کاربند رہا اور جس کی ادارتی پالیسی مالکان نہیں بلکہ مدیر بناتے تھے۔ دوسری اہم بات جو ہمیشہ سے اس کی پالیسی کا حصہ رہی وہ مالکان کی طرف سے واضح ہدایات کہ ان کی کوئی تصویر نہیں دی جائے گی۔ بدقسمتی سے صحافت کا یہ اصول ہمیں دیگر اخبارات ورسائل میں نظر نہیں آیا جس کی وجہ سے آج بھی اس اخبار کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔

بدقسمتی سے ٹی وی جرنلزم میں ہمیں نہ کوئی چراغ حسن حسرت ملا نہ کوئی مظہر علی خان، احمد علی خان نہ کوئی عزیز صدیقی ملا۔ آج کا میڈیا ایسے لوگوں کا تحفظ کرتا ہوا پایا جاتا ہے جو صحافت کے بنیادی اصولوں کو پامال کرتے ہیں۔

یہ کتاب ہمیں معیاری صحافت کے تاریخی اوراق کی طرف لے جاتی ہے جن میں تنقید تو ملے گی مگر کسی کی تذلیل نہیں۔ نہ صرف اداریہ بلکہ سرخی میں بھی کاٹ نظر آئے گی۔ مثلاً اخبارات کی ہڑتال ہوئی تو ڈان کی سرخی تھی:

''There will be no Dawn Tomorrow''

یا پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قتل کے دو سال مکمل ہونے پر زوردار تحریر کا عنوان تھا:

''Unavenged Martyr''

اس زمانے کے اخبارات اور رسائل کے نام بھی معیاری ہوتے تھے اور کام بھی۔ مثلاً

ہفت روزہ لیل ونہار، معیار، الفتح، ویو پوائنٹ، آؤٹ لک یا روزنامہ امروز، امن، مساوات، جسارت، ڈان، مارننگ نیوز، پاکستان ٹائمز اور مشرق وغیرہ۔

آج کی صحافت اور معیار کے موازنہ کے لیے اس کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس کا نام ''صحافت کی متبادل تاریخ'' کیوں رکھا گیا ہے۔ میں ایک بار پھر ڈاکٹر توصیف احمد خان کو مبارکباد دیتا ہوں۔

شکریہ

لیل و نہار

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (PPL) نے 1957 میں ہفت روزہ رسالہ لیل و نہار شائع کیا۔ معروف مارکسسٹ دانشور سید سبط حسن اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ فیض احمد فیض چیف ایڈیٹر، ممتاز ادیب حسن عابدی اور عبدالقادر حسن لیل و نہار کی ادارتی ٹیم میں شامل تھے۔ پی پی ایل کے مالک میاں افتخار الدین کے پیش نظر مولانا عبدالکلام آزاد کا اخبار الہلال، برطانیہ کے ایک انگریزی ہفت روزہ News Statesmen اور نیشن تھے۔ اسی طرح وہ نیویارک سے شائع ہونے والے ہفت روزہ رسالوں نیوز ویک اور ٹائمز کی ترتیب اور طباعت سے بھی متاثر تھے۔ News Statesmen بائیں بازو کا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ میاں صاحب کی خواہش تھی کہ لیل و نہاران ہفت روزہ رسائل کے محاسن کا نچوڑ ہو۔ سید سبط حسن متحدہ ہندوستان میں کئی اخبارات میں کام کر چکے تھے اور انہوں نے مختصر عرصے میں لیل و نہار کو اردو کا ایک بہترین رسالہ بنانے کی کوشش کی۔ لیل و نہار کی بنیادی پالیسی پاکستان میں آزادیٔ اظہار، جمہوریت اور معاشی عدل و انصاف کے فروغ پر مبنی تھی۔ بین الاقوامی امور میں لیل و نہار ایشیا و افریقہ اور جنوبی امریکہ میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرتا تھا۔ لیل و نہار امریکی سامراج کے بڑھتے ہوئے غلبے کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ سید سبط حسن کو اس بات پر فخر تھا کہ انہیں ممتاز صحافیوں اور ادیبوں کا تعاون حاصل تھا۔ پھر عمدہ کاغذ، خوبصورت ترتیب، مواد اور تصاویر کے اعتبار سے یہ بہترین پیشکش تھا۔ لیل و نہار کا 9 مئی 1957 کو 1857 کی جنگ آزادی نمبر شائع ہوا اور اتنا مقبول ہوا کہ اس کی چار بار 10,10 ہزار کاپیاں شائع ہوئیں مگر اس کی مانگ ختم نہیں ہوئی۔ (ا)

دائیں بازو کے ممتاز صحافی عبدالقادر حسن جن کی ابتدائی صحافتی تربیت لیل و نہار میں ہوئی

ہوں نے روزنامہ جنگ اور ایکسپریس میں شائع ہونے والے کالموں میں سید سبط حسن کو
بہترین ایڈیٹر قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لیل ونہار میں کام کرتے ہوئے ان پر کمیونسٹ نظریات
کی حمایت میں لکھنے پر کبھی کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔

لیل ونہار کے اولین ایڈیٹر سید سبط حسن لکھتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ نومبر 1956 میں میاں افتخار الدین نے لیل ونہار کی ایڈیٹرشپ مجھے دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس پرچے کو الہلال اور ہمدرد کی مانند ایک یادگار پرچہ بنانا چاہتا ہوں۔ سبط حسن لکھتے ہیں کہ انہوں نے جواب دیا کہ آپ کو الہلال اور ہمدرد کا انجام شاید یاد نہیں۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ سب یاد ہے لیکن میں اور آپ دونوں جیل کے عادی ہیں۔ پھر ڈر کس بات کا ہے؟ سید سبط حسن نے میاں افتخار الدین کے خیالات کو عملی شکل دینے کی کوشش کی اور لیل ونہار نے پاکستان کی صحافت میں مختصر عرصے میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ پھر جنرل ایوب خان کی حکومت نے 1959 میں پی پی ایل پر قبضہ کرلیا۔ سید سبط حسن کو ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ پھر کچھ عرصے کے لیے ظہیر بابر کو ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ پھر اشتیاق احمد لیل ونہار کے ایڈیٹر بن گئے۔ معروف شاعر صوفی تبسم بھی لیل ونہار کے ایڈیٹر رہے۔ سید سبط حسن کے زمانے میں رسالے کی اشاعت 30 ہزار تھی جو کم ہوکر 4 ہزار تک پہنچ گئی اور پھر یہ رسالہ بند ہوگیا۔ (۲)

ایوب حکومت کے خاتمے کے بعد جنرل یحییٰ خان اقتدار میں آئے۔ یحییٰ خان نے عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا اور صحافت پر عائد پابندیاں ختم کردیں۔ ملک میں پہلی دفعہ اخبارات و رسائل کے ڈیکلریشن کا اجراء آسانی سے ہونے لگا۔ اس وقت تک فیض احمد فیض اور سید سبط حسن کراچی منتقل ہوگئے تھے۔ کراچی سے دوبارہ لیل ونہار شائع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ بائیں بازو کے ممتاز سیاسی رہنما انیس ہاشمی لیل ونہار کے پرنٹر اور پبلشر تھے۔ اتوار 22 فروری 1970 کو لیل و نہار کراچی سے شائع ہوا۔ اس وقت انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا۔ (۳)

لیل ونہار اب خالصتاً سیاسی نوعیت کا پرچہ تھا۔ ملک میں نظریاتی کشمکش تیز ہوگئی تھی۔ ایک طرف بائیں بازو کی جماعتیں تھیں جو سوشلزم اور صوبائی خودمختاری کا پرچار کررہی تھیں اور جاگیرداری کے خاتمے اور صنعتوں کو قومیانے پر زور دے رہی تھیں اور دوسری طرف مذہبی جماعتیں

ذاتی ملکیت کو نصف ایمان قرار دیتی تھیں اور سوشلزم کو گناہ سمجھتی تھیں۔ لیل و نہار کے پہلے اداریہ میں یہ تحریر کیا گیا:

> ''ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں جہاں ایک کثیر آبادی کو نانِ جویں کے لیے روزگار میسر نہیں، کام پر جانے کو سواری نہیں ملتی، تعلیم کے لیے مکتب و مدرسہ میں داخلہ محال ہے، بیماری میں دوا اور چارہ گر مہیا نہیں، ہر ذی شعور شہری کو چاہیے کہ سب سے پہلے اپنے رہنماؤں سے ان مشکلات کا حل دریافت کرے۔ ہماری کوشش ہے کہ ان صفحات میں اسی نوع کے بارے میں صحیح شعور پیدا کیا جائے۔ ہمیں انتخابات اور دساتیر و آئین کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ معاشرے کے کاروبار زندگی کا جوہر نہیں محض اس کی ظاہری صورتیں ہیں۔ اگر اس کاروبار کا نظام صحیح اور منصفانہ ہو تو محض اس قالب کا چولا بدل دینے سے اصلاح احوال نہیں ہو سکتی۔'' (۴)

لیل و نہار سوشلزم کا حامی تھا۔ اس کے اداریوں میں امریکی سامراج کی مخالفت، صوبائی خودمختاری، صوبوں کی زبانوں و ثقافت کے تحفظ اور ترویج کی وکالت کی جاتی تھی۔ انتخابات میں عوامی لیگ مشرقی پاکستان سے قطعی اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ سندھ اور پنجاب سے پیپلز پارٹی، سرحد اور بلوچستان سے نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کامیاب ہوئیں۔ پیپلز پارٹی نے عوامی لیگ کے خلاف فوج سے اتحاد کر لیا اور عوامی لیگ کی اکثریت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ فوج نے مارچ 1971 میں مشرقی پاکستان میں فوج کشی شروع کر دی۔ اب اخبارات کو پریس ایڈوائس کا پابند کر دیا گیا۔ یوں لیل و نہار جو جمہوری قوتوں کا حامی تھا کسی جگہ یحییٰ خان کی پالیسیوں پر تنقید کی اجازت نہیں تھی۔ اس صورتحال میں 11 اپریل 1971 کو لیل و نہار بند ہو گیا۔ اس دفعہ ہفت روزہ ایک سال اور تین ماہ جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ (۵)

ملک کے تمام شہریوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کے بنیادی مطالبے کے لیے لیل و نہار نے کئی اداریے شائع کیے۔ 8 دسمبر 1957 کے اداریہ میں سید سبط حسن مخلوط اور جداگانہ انتخاب کے موضوع پر لکھتے ہیں:

''پاکستان کے مختلف حصوں کے درمیان دشمنی، بدگمانی اور عداوت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ صوبائی عصبیت پہلے بھی موجود تھی اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگ پہلے بھی ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگاتے رہتے تھے لیکن آج کل کوئی نو وارد اگر ہمارے رہنماؤں کے بیانات اور تقریروں کا مطالعہ کرے اور ہمارے ''محبِ وطن'' اخباروں پر سرسری نظر ڈالے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ مشرقی پاکستان مملکتِ پاکستان کا جزوِ لاینفک نہیں ہے بلکہ کوئی دشمن ملک ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن ملک کے خلاف ہمیں ہر قسم کی زہر افشانی کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اگر مشرقی پاکستان کی حکومت مخلوط انتخاب کے حق میں ہے تو وہ لازماً ہندوؤں کے زیرِ اثر ہوگی۔ اگر وہاں کے سیاسی رہنما اور اسمبلی کے ممبر صوبائی خود مختاری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے ایجنٹ ہیں اور پاکستان کی سالمیت کے دشمن ہیں۔ اسی طرح اگر مولانا بھاشانی یا مسٹر سہروردی کے خلاف شر پسند عناصر کراچی یا لاہور میں مظاہرہ کرتے ہیں تو مشرقی پاکستان کے لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مغربی پاکستان کے لوگ بنگالیوں کے دشمن ہیں اور اگر مسٹر سہروردی کے بجائے مسٹر چندریگر وزیر اعظم ہو جاتے ہیں تو یہ بنگالیوں کے حق پر شدید حملہ ہے۔ یہ بدگمانیاں فقط دونوں صوبوں کے درمیان نہیں پائی جاتیں بلکہ پٹھان پنجابیوں سے بدظن ہیں، پنجابی مہاجروں کے خلاف اور سندھی اہلِ کراچی سے خوار کھائے بیٹھے ہیں۔ غرض افتراق اور نفرت کا ایک سیلاب ہے جو ان دنوں پورے ملک پر مسلط ہے۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پاکستان کے مقتدر افراد اور ذی اثر ادارے اس تشویش ناک صورتحال کے انجام و عواقب سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس چنگاری کو یوں ہی ہوا دی گئی تو ایک دن پاکستان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ اربابِ اقتدار کی جانب سے وقتاً فوقتاً صوبائی عصبیت کو ختم

کرنے کے عزم کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ان حضرات کو اپنے ذاتی اور جماعتی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے بعض اوقات ایسے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کا منطقی نتیجہ صوبائی عصبیت میں مزید اضافے کی شکل میں نکلتا ہے۔ ہمارے اربابِ اختیار کی عقدہ کشائیاں لائق داد ہیں کہ وہ ایک گتھی سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو قوم کے رشتہء حیات میں کئی سوئی گرہوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ پہلے جداگانہ انتخاب پر زور دیا گیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو جداگانہ انتخاب منظور نہیں تو مشرقی پاکستان کیلئے مخلوط انتخاب اور مغربی پاکستان کے لیے جداگانہ انتخاب کی تجویز منظور ہوئی۔ جب اپنوں بیگانوں سب نے اس مضحکہ خیز فیصلے کا مذاق اڑایا تو دونوں صوبوں کے لیے مخلوط انتخاب منظور ہوا۔ لیکن اس عبوری دور میں جبکہ عام انتخابات ہی خطرے میں ہیں جمہوریت کے بنیادی تقاضوں سے لاپرواہ ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھانا جس سے انتخابات معرضِ التواء میں پڑ جائیں اور صوبائی عصبیت کو اور فروغ ہو پاکستان کے اتحاد اور سالمیت سے دشمنی کرنا ہے۔ کاش اربابِ اختیار اپنے ذاتی اور جماعتی مفاد کے بجائے پاکستان کے قومی اور ملی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے۔"(٦)

سید سبط حسن نے 22 ستمبر 1957 کے شمارے میں "ایک یونٹ اور جذباتیت" کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا اور ون یونٹ کی ناکامی پر روشنی ڈالی:

"جب سے مغربی پاکستان اسمبلی نے ایک یونٹ کو توڑ کر صوبوں کی ازسرِ نو تشکیل اور علاقائی فیڈریشن کی تجویز منظور کی ہے بعض حلقے بہت مسرور ہیں گویا ہم نے ہفت خواں فتح کر لیا ہے۔ گویا مغربی پاکستان کے باشندوں کے تمام مصائب و آلام اسی ایک یونٹ کے پیدا کردہ تھے اور ایک یونٹ کے ٹوٹنے کے بعد سندھ، سرحد، پنجاب اور بلوچستان کے خود مختار صوبوں میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔ دوسری جانب بعض حلقے یوں مغموم اور آتشِ زیرِ پا ہیں

گویا ایک یونٹ ختم ہوا تو قیامت آجائے گی اور پاکستان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ حالانکہ دو سال بیشتر تک یہاں کسی نے ایک یونٹ کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اس کے باوجود پاکستان قائم تھا اور پاکستانیوں کی قومی وحدت برقرار تھی۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کی غیر جمہوری فضاء میں جذباتیت اتنی جاری وساری ہے کہ ہر مسئلے کو (خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا ثقافت سے، اقتصادیات سے ہو یا مذہب سے، نظم ونسق سے ہو یا رسم ورواج سے) جذباتی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور اس کی موافقت اور مخالفت میں جو دلیلیں دی جاتی ہیں وہ بھی خالص جذباتی ہوتی ہیں۔ جذباتیت کی اس فراوانی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اہم سے اہم قومی مسئلے پر بھی اب ہم سنجیدگی سے غور وفکر کی عادت ترک کرتے جاتے ہیں۔ ایک یونٹ کو ہی لے لیجئے۔ اربابِ اختیار کو دفعتاً القا ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو توڑ کر ایک وحدت میں ضم کر دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک یونٹ کی تحریک کرنے والوں کا نیک نیتی سے یہ خیال ہو رہا ہے کہ ایک یونٹ کے بننے سے ملک وقوم کا بھلا ہوگا لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو غیر جمہوری اور آمرانہ طریقہ کار اختیار کیا گیا اس کی تفصیلات کسی دوسرے صفحے پر ملاحظہ کیجئے۔ جذباتی انداز میں پروپیگنڈے کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈ آیا تھا اور خوف ودہشت کا یہ عالم تھا کہ کوئی اخبار ایک یونٹ پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ ایک یونٹ کی تجویز نہ تھی کوئی صحیفہء آسمانی تھی، جذباتیت سے قطعِ نظر وہ کون سی دلیل تھی جو ایک یونٹ کے حق میں نہیں دی گئی۔ نظم ونسق کے مصارف گھٹ جائیں گے، قانونی یکسانیت پیدا ہو جائے گی۔ صوبائی تعصب ختم ہو جائے گا، قومی تعمیر کے کاموں میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی وغیرہ وغیرہ۔ اور تو اور قائد اعظم کی تقریروں سے بھی اس کا جواز ڈھونڈ لیا گیا۔ بعض حلقوں کی طرف سے اس کی کامیابی پر شبہ کا اظہار کیا گیا اور یہ مشورہ دیا گیا کہ اگر ایک یونٹ میں اتنے محاسن پوشیدہ ہیں تو پھر عوام کی مرضی کیوں نہ معلوم کر لی جائے کیونکہ وہ پاگل تو نہیں کہ اتنی مفید اور سود مند تجویز کو رد کر دیں۔ لیکن جس نے اس جمہوری طریقہ کار کی حمایت کی اسے غدار، پاکستان کا دشمن، غیر ملکی طاقتوں کا ایجنٹ کہہ کر خاموش کر دیا گیا یا جیل میں بند کر دیا گیا۔ اور پھر ایک یونٹ کا قیام بڑے طمطراق سے عمل میں آیا۔

دو سال تک مغربی پاکستان کے لوگوں کو یہ مہنگی پڑا ہوا دودھ ملتا رہا اور لوگوں نے اپنے تجربے سے دیکھ لیا کہ ایک یونٹ کے حق میں جو جذباتی دلیلیں دی جاتی تھیں وہ بالکل بے بنیاد تھیں۔ نہ صوبائی تعصب کم ہوا نہ نظم ونسق کے مصارف گھٹے اور نہ قانون میں یکسانیت پیدا ہوئی۔ حالات بہتر ہونے کے بجائے اور بدتر ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک یونٹ، نظم ونسق کا ایک تجربہ تھا اور اس کے بعض سیاسی مقاصد تھے۔ نظم ونسق کا یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا ہے اور وہ سیاسی تقاضے اب باقی نہیں رہے جو اس تجویز کے محرک تھے۔ بعض حلقے آئین کے تقدس کی آڑ لے کر لوگوں کے جذبات مشتعل کر رہے ہیں حالانکہ آئین بھی ایک یونٹ کی مانند ہم خاکی انسانوں ہی کا بنایا ہوا ہے اور ہم چاہیں تو فقط ایک دو نہیں بلکہ اس کی تمام دفعات کو بدل سکتے ہیں۔ خود ہمارے آئین کے اندر آئین میں ترمیم کرنے کا حق موجود ہے۔'' (۷)

1958 میں ایک اہم معاملہ عام انتخابات کا انعقاد تھا جو کنفیوژن کا شکار رہے۔ 2 فروری 1958 کے اداریہ میں کہا گیا:

''عام انتخابات ہونگے بھی یا نہیں اور ہونگے تو کب؟ ان سوالوں کا تشفی بخش جواب فقط ایوانِ اقتدار سے مل سکتا ہے کیونکہ محلاتی سازشوں اور ہر آن بدلتی ہوئی وزارتوں کی مصلحت اندیشیوں کے اس ماحول میں کوئی شخص بھی پیش گوئی کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ عام انتخابات کے بارے میں ہمارے اندیشے شاید درست نکلیں۔ کبھی افواہ اڑتی ہے کہ الیکشن کمشنر نے فہرست سازی کا کام رکوا دیا ہے۔ کبھی خبر آتی ہے کہ طریقہ انتخاب میں تبدیلی ہونے والی ہے، یعنی مشرقی پاکستان میں انتخابات مخلوط اصولوں کے مطابق ہوں گے اور مغربی پاکستان میں جداگانہ اصول نیابت کی بنیاد پر لیکن ان افواہوں کی حیثیت اب تک غیر سرکاری جماعتوں کے پروپیگنڈے سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اب خود حکومت کے ذمہ دار حلقے الیکشن کے بارے میں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جن سے ہمارے اندیشوں کو تقویت پہنچتی ہے چنانچہ گذشتہ ہفتے جناب شیخ مسعود صادق وزیر بحالیات مغربی پاکستان

نے راولپنڈی کے مقام پر قوم کو یہ مژدہ سنایا کہ عام انتخابات نومبر 1958 کے بجائے اگلے سال مارچ یا اپریل میں ہوں گے۔ وزیر با تدبیر نے اس التوا کے لیے عذر یہ پیش کیا کہ شمال مشرقی علاقے کے لوگ نومبر کی سردیوں کی تاب نہ لا سکیں گے اور چونکہ جمہوریت کا تقاضہ ہے کہ ملک کے سب باشندوں کو مساوی مواقع فراہم کیے جائیں لہٰذا عام انتخابات کو تین چار ماہ تک کے لیے ملتوی کر دینا مناسب ہوگا۔

الیکشن اگر بدقسمتی سے ایک بار پھر ملتوی ہو گئے تو اس کی ساری ذمہ داری ملک کی سیاسی جماعتوں پر ہوگی۔ نوکر شاہی کا تو مفاد اسی میں ہے کہ ملک میں جمہوری روایات قائم نہ ہوں۔ ہمارے وہ ملکی رہنما بھی جو نوکر شاہی کی راہ سے اقتدار کی کرسیوں تک پہنچے ہیں ابھی تک دفتری ذہنیت سے نکل نہیں سکتے اس لیے ان سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ وسعتِ نظر سے کام لیں اور ذاتی مفاد کو قومی مفاد سے ہم آہنگ کرنے کی طرح ڈالیں۔

اگر ہماری سیاسی جماعتیں چاہتی ہیں کہ ملک میں جمہوریت کو فروغ ہو تو انہیں اپنی اس غلامانہ ذہنیت میں تبدیلی کرنی ہوگی اور ایوانِ اقتدار کو متنبہ کرنا ہوگا کہ وہ الیکشن میں مزید تاخیر کو برداشت نہ کریں گی۔'' (۸)

تحریک آزادی کے عظیم رہنما ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ تھے۔ انہیں خاکسار تحریک کے ایک کارکن نے قتل کر دیا۔ مئی 1958 کے اداریہ میں ڈاکٹر خان صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا گیا:

''ڈاکٹر خان صاحب قتل کر دیئے گئے۔ قاتل کے خنجر نے جنگِ آزادی کا ایک اور آزمودہ کار سپاہی ہم سے چھین لیا۔ مگر یہ خنجر ایک مرد کہن سال کے سینے ہی میں پیوست نہیں ہوا یہ خنجر پاکستان کے سینے میں بھی پیوست ہوا ہے۔ اس خنجر سے ہماری جمہوریت کا خون ہوا ہے۔ نیکی، سادگی اور خلوص کا خون ہوا ہے، اخوت اور انسانیت کا خون ہوا ہے۔ پاکستان کا یہ مردِ مجاہد گذشتہ ربع صدی سے

ملک وقوم کی خدمت میں مصروف تھا۔ اس نے سرحد میں جنگِ آزادی کا پرچم اس وقت بلند کیا جب برطانوی اقتدار کی ہیبت سے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہوتا تھا اور وہ سورما جو آج حب الوطنی کے اجارہ دار بنے پھرتے ہیں غیر ملکی آقاؤں کی کفش برداری میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب نے نہ نام ونمود اور عزت ومرتبت کی خاطر قربانیاں دیں اور نہ کبھی ان قربانیوں کا معاوضہ طلب کیا۔ وزارت نے متعدد باران کے قدم چومے اور اقتدار نے بارہا ان کی راہ میں آنکھیں بچھائیں مگر ان کی زندگی دولت وثروت کی آلودگیوں سے ہمیشہ بے داغ رہی۔ نہ کبھی ان کے مزاج وکردار میں تبدیلی آئی نہ رہن سہن میں۔ نہ ان کی دوستی اور مروت میں فرق آیا نہ اخلاق اور غریب نوازی میں۔ ان کی ہر دلعزیزی کا راز اسی قلندرانہ بے نیازی میں پوشیدہ ہے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کے بعد ڈاکٹر خان صاحب کی اچانک موت ایک قومی المیہ ہے جس پر ملک کے ہر گوشے میں ماتم کیا جائے گا۔ ایک نقصانِ عظیم ہے جس کی تلافی نہ ہو سکے۔"(۹)

جون 1958 میں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ عطاء الرحمٰن کی وزارت مستعفی ہوگئی اور پھر بحران پیدا ہوا۔ 22 جون 1958 کے شمارے میں سید سبط حسن نے اس بحران کی اصلی وجہ کو یوں بیان کیا:

"مسٹر عطاء الرحمٰن کی وزارت بالآخر مستعفی ہوگئی کیونکہ 18 جون کو جب مشرقی پاکستان اسمبلی کا اجلاس ہوا تو عوامی لیگ پارٹی اکثریت کا اعتماد حاصل نہ کر سکی۔ خود نو عدد عوامی لیگی ممبر حزب اختلاف میں شامل ہوگئے۔ دس عدد کانگریسیوں نے بھی حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا اور نیشنل عوامی پارٹی جس کے 28 ممبروں نے مارچ کے اجلاس میں عوامی لیگ کی حمایت کی تھی اس دفعہ غیر جانبدار رہی۔ اس طرح مسٹر عطاء الرحمٰن 47 ارکان کی تائید سے محروم ہوگئے اور جب رائے شماری ہوئی تو ان کو 138 کے مقابلے میں 126 ووٹ ملے۔

وزارت ٹوٹ گئی۔ کہنے کو تو جو کچھ ہوا بڑے آئینی اور جمہوری طریقے پر ہوا لیکن جو لوگ مرکزی اور صوبائی سربراہوں کی حالیہ سرگرمیوں سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں ان کو اس وزارتی بحران کے اسباب و محرکات کی تہہ تک پہنچنے میں چنداں دشواری نہ ہوگی۔ وہ ریشہ دوانیوں کے رشتے باآسانی جوڑ سکتے ہیں اور ان سے نتائج بھی اخذ کر سکتے ہیں۔" (۱۰)

صدر اسکندر مرزا نے ری پبلکن پارٹی راتوں رات قائم کی۔ مرکز میں مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی حکومت بنی جو ایک ماہ بعد ٹوٹ گئی۔ لیل و نہار کے 24 نومبر 1957 کے اداریہ میں اس وزارتی بحران کا تجزیہ کیا گیا:

"مرکز میں مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی مخلوط وزارت غالباً ایک ہی ماہ میں اپنی عمرِ طبیعی کو پہنچ گئی ہے۔ آئندہ چند دنوں میں طریقِ انتخاب کے مسئلے پر اگر نیا وزارتی بحران پیدا ہو جائے تو اس پر کسی کو حیرت نہ ہوگی۔ وزیراعظم مسٹر چندریگر نے برسرِ اقتدار آتے ہی جداگانہ طریقِ انتخاب کے سوال پر کچھ اس طرح اصرار کرنا شروع کیا کہ نئی کولیشن کا مستقبل سابقہ کولیشن وزارت سے بھی زیادہ مشکوک نظر آنے لگا۔ ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے اتحاد کی تو کسی حد تک نظریاتی اساس بھی تھی کیونکہ طریقِ انتخاب اور (ابتدا میں) ایک یونٹ کے بارے میں ان کے مؤقف میں ہم آہنگی موجود تھی لیکن نئی کولیشن کے قیام سے پہلے مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی اپنی تمام نظریاتی قلابازیوں کے باوصف طریقِ انتخاب کے سوال پر واضح اختلافِ رائے رکھتی تھیں۔ اس کے باوجود دونوں پارٹیوں کی مخلوط وزرات بنی۔ مگر افسوس ہے کہ اقتدار کی جنگ کا خاتمہ نہ ہو سکا بلکہ سیاسی رسہ کشی بدستور جاری رہی اور اب تمام زورِ بیاں اس بات پر صرف کیا جا رہا ہے کہ ملک و قوم کی بقاء جداگانہ طریقِ انتخاب پر منحصر ہے۔ اس کا تصفیہ ہوا تو ملک کے سارے مسائل کی گرہیں خود بخود کھل جائیں گی۔" (۱۱)

سید سبط حسن نے 20 اکتوبر 1957 کے شمارے میں وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کے پارلیمنٹ کے اعتماد کے مطالبے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''گذشتہ دس سال میں اربابِ اقتدار کی جانب سے بار بار یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں پارلیمانی جمہوریت کا راج ہے لیکن جب کبھی اس قول کو فعل کی کسوٹی پر پرکھنے کا وقت آیا ہے تو تمام دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم کے انتقال کے بعد سے اب تک مرکزی حکومتیں پانچ بار بدلی جا چکی ہیں لیکن ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ تبدیلی ملکی پارلیمنٹ کی مرضی سے ہوئی ہو۔ مانا کہ ہماری پارلیمنٹ ملک کے آٹھ کروڑ باشندوں کی صحیح نمائندہ نہیں ہے لیکن بہرصورت پارلیمنٹ ہے اور کسی ایک فرد سے خواہ وہ کتنا ہی دانا و تجربہ کار کیوں نہ ہو قوم کی بہتر مزاج شناس اور نمائندہ ہے اس لیے پارلیمانی روایت کا تقاضہ یہی تھا کہ ہر بار وزیر اعظم کو علیحدہ کرنے سے پیشتر پارلیمنٹ کی مرضی معلوم کر لی جاتی۔ جہاں مرکزی وزارتوں کا یہ حشر ہو وہاں صوبائی وزراتوں کو کون خاطر میں لاتا۔ چنانچہ صوبائی گورنروں نے ایک نہیں متعدد بار صوبائی وزارتوں کو بیک جنبشِ قلم برطرف کیا اور یہ عذر پیش کرنے کی بھی زحمت نہ کی کہ انہیں صوبائی اسمبلیوں کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک یونٹ سے پیشتر میاں مشتاق احمد گورمانی نے ملک فیروز خاں نون کی وزارت کو اسی طرح برطرف کیا تھا۔ نئے آئین کے نفاذ کے بعد توقع تھی کہ پارلیمانی جمہوریت کی کوئی بہتر روایت قائم ہو گی لیکن گزشتہ مئی میں میاں مشتاق احمد گورمانی نے مغربی پاکستان کی وزارت اور اسمبلی کو برطرف کر کے یہ ثابت کر دیا کہ یہ توقعات عبث تھیں۔ حیرت ہے کہ وزیر اعظم حسین شہید سہروردی نے بھی جو آج پارلیمنٹ کے اعتماد کی باتیں کرتے ہیں اس وقت یہ نہ کہا کہ مغربی پاکستان اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسمبلی کی اکثریت کس کے ساتھ ہے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ جو حربہ انہوں نے مئی

میں مغربی پاکستان اسمبلی کے خلاف استعمال کیا تھا 11 اکتوبر کو وہی حربہ ان کے خلاف استعمال کیا گیا۔'' (۱۲)

رسالہ نے 13 اپریل 1958 کی انتخابی ''حد بندی کے بعد'' کے عنوان سے لکھا:

''حد بندی کمیشن کی رپورٹ کا پورا متن تا دمِ تحریر اخباروں میں شائع نہیں ہوا ہے۔ اس لیے ہم اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں البتہ اب کہ حد بندیوں کا کام ختم ہو چکا ہے اور ووٹروں کی فہرستیں بھی چھپ رہی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ الیکشن کمیشن عام انتخابات کی تاریخوں کا جلد اعلان کر دے گا۔ مختلف حلقوں سے الیکشن کے بارے میں جن شکوک وشبہات کا اظہار کیا جا رہا ہے ان کو رفع کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کی تاریخیں جلد متعین کر دی جائیں۔ عام انتخابات جمہوریت کا سنگِ بنیاد ہیں۔ چنانچہ ہم نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ملک میں جمہوریت کی بقاء اور فروغ کے لیے ضروری ہے کہ عام انتخابات جلد ہوں لیکن ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو انتخابات کو ہر مرض کی دوا سمجھے بیٹھے ہیں یا جن کا خیال ہے کہ عام انتخابات کے بعد ملک کے تمام مسائل چشمِ زدن میں حل ہو جائیں گے۔ عام انتخابات جلد ہونے چاہئیں کہ جمہوریت کا تقاضہ یہی ہے لیکن موجودہ حالات میں اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ انتخابات آزاد اور غیر جانبدار ہوں گے۔ یہ درست ہے کہ صدر محترم اور وزرائے عالی مقام نے ہمیں بار بار یقین دلایا ہے کہ وہ انتظامیہ کو انتخابات میں مداخلت کرنے کی اجازت نہ دیں گے لیکن اس کا کیا علاج کہ الیکشن کا سارا کاروبار خود انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہوگا اور گذشتہ دس بارہ سال میں انتظامیہ کے افسرانِ اعلیٰ میں سیاسی امور میں مداخلت کی جو ذہنیت پیدا ہوگئی یا پیدا کی گئی ہے وہ حکومت کے اعلانوں سے تو نہ بدلے گی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت مغربی پاکستان میں سیاسی طاقت ان صاحبِ ثروت لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کی ''قوت خرید'' کی زد سے بڑے سے بڑا افسر بھی محفوظ

نہیں۔ پھر یہ کیوں کر باور کرلیا جائے کہ وہ اقتدار پرست حضرات جن کو عہدوں کی خاطر اپنا اصول، اپنی جماعت اور اپنا نصب العین تبدیل کرتے ذرہ برابر جھجک نہیں ہوتی الیکشن کے موقع پر انصاف، ایمان اور دیانت کا جامہ زیبِ تن کرلیں گے۔ بفرضِ محال اگر یہ مان لیا جائے کہ سرکاری افسر الیکشن میں کسی فرد یا جماعت کی پاسداری نہ کریں گے تو بھی اس کا قوی اندیشہ ہے کہ ہمارے دیہاتی حلقوں سے اور اکثریت انہیں کی ہے جانی پہچانی شکلیں دوبارہ اسمبلیوں میں واپس آجائیں گی۔ شہروں میں تو دو چار سیاسی پارٹیاں بھی موجود ہیں۔ اخبارات بھی ہیں اور رائے عامہ بھی کسی حد تک سیاسی سوجھ بوجھ رکھتی ہے مگر دیہات تو خیر سے ہمارے نوابوں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی ذاتی ملکیت ہیں۔ وہاں انہیں حضرات کا سکہ چلتا ہے۔ مزید برآں وہاں ہنوز برادری، قوم اور خاندانی تعلقات کے نام پر ووٹ مانگا جاتا اور ملتا ہے۔
گذشتہ دس برس میں کسی سیاسی جماعت کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ دیہات کے لوگوں کا سیاسی شعور بیدار کرتی۔'' (۱۳)

مشرقی پاکستان میں چوتھی بار صدر راج نافذ ہوا تو 29 جون 1958 کو شائع ہونے والے اداریہ میں سید صاحب نے لکھا:

''آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مرکز نے مشرقی پاکستان کی وزارت کو برطرف کر کے صوبے میں صدر راج نافذ کردیا۔ عذر یہ کیا گیا ہے کہ موجودہ حالات میں وہاں کوئی مستحکم اور پائیدار وزارت قائم نہیں ہوسکتی۔ ثبوت کے طور پر اسمبلی میں عطاء الرحمٰن وزارت اور سرکار وزارت کی شکستوں کو پیش کیا گیا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو دعویٰ جتنا بے بنیاد ہے دلیلیں اتنی ہی کمزور ہیں۔ مشرقی پاکستان میں گزشتہ چار برس میں پارلیمانی حکومت چار بار برطرف کی گئی اور ہر بار یہی عذر پیش کیا گیا کہ وہاں کوئی مستحکم اور پائیدار وزارت قائم نہیں ہوسکتی۔ اگر صورتحال واقعی یہی تھی تو اس کو ختم کرنے کا آسان

اور جمہوری طریقہ یہ تھا کہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات دوبارہ کروائے جاتے لیکن مرکز نے ایسا نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ توڑ جوڑ اور سودے بازی کا بازار گرم رہا۔ مخلوط وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں اور جمہوری روایات کا خون ہوتا رہا۔ اقتدار نے اس جوڑتوڑ کی مذمت کرنے کے بجائے اس سازشی عناصر کی ہمت افزائی کی جو وزارت سازی اور وزارت شکنی کے فن میں طاق تھے۔

بہر حال اب کہ مشرقی پاکستان میں صدر راج قائم ہو چکا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مرکز دو ماہ کے اندر ہی پارلیمانی وزارت کو بحال کرنے کی کوشش کرے گا تا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ کراچی کے اربابِ اقتدار ان کو ان کے آئینی حق سے محروم کرنے کے درپے ہیں۔ عوامی لیگ کے بدترین دشمنوں نے بھی دفعہ 193 کے نفاذ کو 'افسوس ناک حادثے'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس صورتحال میں تدبر کا تقاضا یہی ہے کہ بجٹ کی منظوری کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو پارلیمانی حکومت کو بحال کر دیا جائے تا کہ تلخیوں اور غلط فہمیوں میں مزید اضافہ نہ ہونے پائے اور مرکزی وزارت کسی نئے بحران کا شکار نہ ہو۔'' (۱۴)

سید سبط حسن نے 8 مارچ 1959 کو آئین سازی کے اہم مسئلہ پر لکھا:

''ہمارے ملک میں آئین کو منسوخ ہوئے آہستہ آہستہ پانچ ماہ سے زیادہ مدت ہو چکی ہے۔ اس درمیان نئی حکومت کے ترجمانوں نے ایک سے زائد بار قوم کو یہ یقین دلایا ہے کہ جمہوریت کو بحال کرنے اور جمہوری آئین کو وضع کرنے میں تاخیر نہیں ہوگی۔ حال ہی میں وزیر خارجہ مسٹر منظور قادر نے مشرقی پاکستان اور کراچی میں آئین کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے یہ امید اور بھی قوی ہوتی ہے کہ حکومت آئین سازی کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور کر رہی ہے اور اربابِ اختیار عام لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے خواہش مند بھی ہیں۔ چنانچہ مسٹر منظور قادر کے حالیہ دورے کا مقصد بھی

یہی تھا اور اب وہ اسی غرض سے مغربی پاکستان کا بھی دورہ کریں گے۔ مسٹر منظور قادر نے ایک بار پھر ہمیں یقین دلایا ہے کہ ''آئین وضع کرنے میں ایک لمحے کی بھی غیر ضروری تاخیر نہ ہوگی'' البتہ اس سے پہلے لوگوں کی ازسرِ نو تعلیم کا کام مکمل کرنا ہوگا اور ملک کے جہاز کو سطحِ آب پر لانا ہوگا۔ انہوں نے فرمایا ''آئین سازی میں عجلت کرنا اور ایسی صورتِ حالات پیدا کرنا جیسی پاکستان میں 7 اکتوبر سے پیشتر تھی'' غلط ہوگا۔'' (۱۵)

1971 میں مشرقی پاکستان میں خوف ناک طوفان آیا۔ لاکھوں لوگ مر گئے مگر مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اس طوفان کے نقصانات کو محسوس نہیں کیا۔ فیض نے ''اے دیدہ خوننابہ بار'' کے عنوان سے لکھا:

''مشرقی پاکستان کو گلہ ہے کہ 65 میں جنگ چھڑی تو ہم نے انہیں اللہ کے بھروسے پر تنہا چھوڑ دیا اور اب ان کے سر پہ قیامت گزر گئی تو یہاں سے کوئی ان کا ہاتھ تھامنے نہ آیا۔ یہ گلہ اپنی جگہ بجا سہی لیکن اس میں مغربی پاکستان کے عوام کی کچھ ایسی خطا نہیں، اس قیامت کے آثار 12 نومبر کی ہلاکت آفریں رات سے پورا ایک ہفتہ پہلے نہ صرف نمودار ہو چکے تھے بلکہ مقامی حکام اس سے مطلع بھی ہو چکے تھے، پورے سات دن پانیوں اور فضاؤں میں تباہی اور بربادی کا سامان بہم ہوتا رہا اور کسی نے نواکھلی، بھولا، کھلنا اور چاٹ گام کی ان گنت بے سروسامان مخلوق کو آگاہ نہ کیا کہ آسمانوں میں ان کی خانہ ویرانی کے کیا مشورے ہو رہے ہیں، موسمیات کے حکام، نشریات کے سربراہ، انتظامیہ کے افسر، کوئی ٹس سے مس نہ ہوا، صرف ریڈیو پر اتنا اعلان کافی سمجھا گیا کہ طوفان آ رہا ہے، کیسا طوفان، یہ کسی نے نہ بتایا اور جب طوفان کے بجائے قیامت ٹوٹ پڑی تو دو دن صوبائی حکومت یوں گم سم بیٹھی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تیسرے دن گورنمنٹ ہاؤس میں اعلیٰ سطح کانفرنس منعقد ہوئی لیکن جب بھی کسی کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ قیامت زدگان کتنے تھے، اور ان کا حشر کیا ہوا۔

اندازہ ہوتا بھی کیسے؟ سرکاری اطلاعات تو سرکاری افسر ہی بہم پہنچاتے ہیں۔ یعنی ڈپٹی کمشنر، تھانیدار، تحصیلدار، مختار کار، چوکیدار وغیرہ تو ان دنوں ڈپٹی کمشنر صاحبان تو سب ڈھاکہ میں جمع تھے اور ماتحت عمل دار یا گھروں میں دبکے بیٹھے تھے یا تتر بتر ہو چکے تھے، چنانچہ مرنے والوں کی گنتی پہلے سینکڑوں پھر ہزاروں، پھر لاکھوں تک پہنچی لیکن اب تک بے گور و کفن لاشوں کا کسی نے شمار کیا ہے، نہ ان لاتعداد مرد و زن کا جو غرق دریا ہو کر بے گور و کفن موت کی رسوائی سے بچ گئے۔ اگر گھر میں یہ حال تھا تو ہم ہزاروں کوس دور بیٹھے سبک ساران ساحل کو اپنے ہم وطنوں کی افتاد کا صحیح اندازہ کیسے ہوتا؟''(۱۶)

صحافیوں کی نمائندہ تنظیم پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) نے صحافیوں اور غیر صحافتی عملے کو عبوری امداد دینے کے لیے اپریل 1970 میں 10 روز تک ہڑتال کی جس کے بعد مختلف اخبارات سے دو سو کے قریب صحافی اور اخباری کارکن برطرف کر دئے گئے۔ فیض احمد فیض نے صحافیوں کی حمایت میں اداریہ ''دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچئے'' کے عنوان سے لکھا:

''عامل صحافیوں اور اخبارات سے متعلق غیر صحافی کارکنوں کی ملک گیر ہڑتال پاکستان کی تاریخ کا ایک اچھوتا واقعہ ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اتنے وسیع پیمانے پر ہڑتال کا اقدام کیا گیا اور نہایت کامیابی سے، اور وہ بھی سفید پوش دانشوروں کی جماعت نے، صنعتی کارکنوں نے نہیں جنہیں ہڑتالوں کا وسیع تجربہ ہے اور جن کی پشت پناہ ایک ہی جگہ مجتمع افرادی طاقت ہوتی ہے۔ جبکہ اخباری عملے کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں پورے مشرقی اور مغربی پاکستان میں منتشر ہیں، ایسی منتشر برادری کا یہ واقعی بڑا کارنامہ ہے۔

پہلی مرتبہ ہر مکتبہ فکر، بائیں بازو، دائیں بازو اور اعتدال پسند سے تعلق رکھنے والی تمام سیاسی جماعتوں نے (بعض ظاہر ہے کہ خوش دلی سے نہیں) اس جدوجہد کی جو کارکنوں نے ایک طبقہ کی حیثیت سے آجروں کے طبقہ کے خلاف شروع کی ہے، حمایت کی۔ حتیٰ کہ رائے عامہ کے ان حلقوں کو بھی جو کسی

بھی نوعیت کے طبقاتی اقدام کو تخریبی انتشار پسند اور سوشلسٹ تحریک پر کیا جانے والا اقدام وغیرہ کہہ کر مذمت کرتے رہے ہیں مجبوراً آجروں کے مقابلے میں کارکنوں کی حمایت کرنی پڑی ہے۔

جو کچھ ہو چکا ہے اس کو اب صرف اسی صورت میں کالعدم کیا جاسکتا ہے کہ اخبارات کے منتظمین جن کی نمائندگی اے پی این ایس کرتی ہے ان تمام باتوں کو منظور کرلیں جو انہیں قوم کے سامنے بے نقاب ہونے سے پہلے 15 اپریل ہی کو منظور کرلینی چاہیے تھیں۔ اس پورے تنازعہ کا بنیادی نکتہ اے۔پی۔این۔ایس کا یہ مؤقف ہے کہ وہ اجتماعی سودے بازی کے ایجنٹ کی حیثیت سے اقدام کرنے کی موافقت میں نہیں لہٰذا ہر ورکنگ یونٹ کو اپنی انتظامیہ سے مذاکرات کرنے چاہئیں۔ان کا یہ مؤقف سرسری جائزے کی بھی تاب نہیں لاسکتا۔

پہلی بات یہ ہے کہ اگر اے پی این ایس مالکوں اور انتظامیہ کی تنظیم کی حیثیت سے کوئی اجتماعی اقدام نہیں کرسکتی تو پھر اس کے وجود کا جواز کیا ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ پی ایف یو جے سے مذاکرات کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو پھر وہ بطور پارٹی ویج بورڈ کے سامنے کس حیثیت سے پیش ہوئی تھی؟ تیسری بات یہ ہے کہ اکثر سُننے میں آیا ہے کہ یہ تنظیم حکومت سے مراعات حاصل کرنے کے لیے اجتماعی مطالبات پیش کرتی رہی ہے۔کیا وہ ہمیں یہ باور کرائیں گے کہ وہ اپنے لیے تو مراعات حاصل کرنے کی غرض سے حکومت سے مذاکرات کرنے کے لیے بطور اجتماعی ایجنٹ کام کرنے میں حق بجانب ہیں لیکن اپنے ہی کارکنوں کو مطلوبہ مراعات دینے کے لیے ان سے مذاکرات کرنے کے لیے بطور اجتماعی ایجنٹ کام کرنا ان کے دائرہ کار سے باہر ہے؟

اس سلسلہ میں دو باتیں اور محلِ نظر ہیں اوّل یہ کہ Wage Award میں حکومت بھی ایک فریق ہے۔اس لیے موجودہ کشمکش میں حکومت کا محض تماشائی

بنے رہنا جائز نہیں۔ ایوارڈ کے نفاذ کی ذمہ داری حکومت کی انتظامیہ کی بھی ہے اور اسے ہر معاملہ میں مداخلت کرنی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض اطلاعات کے مطابق پی پی آئی کو پہلے محکمہ ڈاک کے کچھ ملازمین کی خدمات مستعار دی گئیں اور جب اس پر احتجاج ہوا تو کچھ کارکن ایران سے درآمد کیے گئے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ انتہائی قابل اعتراض بات ہے۔ اگر ایک دوست ملک کے باشندوں کو ہمارے ملک کی ہڑتال توڑنے کے لیے Black Legs کے طور پر استعمال کیا گیا تو اس سے ہماری دوستی میں خلل ہوگا۔ دونوں حکومتوں کو اس کا سدباب کرنا چاہیے۔"(۱۷)

نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ نے پنجاب کے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک تاریخی کسان کانفرنس منعقد کی۔ فیض نے "کسان کانفرنس" کے عنوان سے لکھا:

"ہمارے ہاں کسان اور ہاری کمیٹیاں ایک زمانے سے کام کر رہی ہیں۔ چھوٹے یا بڑے پیمانے پر ان تنظیموں کے اجلاس یا کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی رہتی ہیں لیکن نہ ہمارے اخبارات نے کبھی انہیں قابل اعتنا گردانا نہ ہمارے ارباب سیاست نے قابل توجہ سمجھا اور اب چند دنوں سے قریب قریب ہر اخبار میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس کا چرچا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان اخبارات میں بیشتر سیاسی رہنماؤں کی تقاریر کا خلاصہ درج ہے اور کانفرنس کی صحیح نوعیت یا اہمیت کا ذکر نہیں ملتا، اس ضمن میں سب سے دلچسپ ردعمل لاہور کے ان جریدوں کا ہے جو عوامی مفاد کی ہر کوشش کو وطن دشمنی یا اسلام دشمنی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی صاحب نے کانفرنس کی حاضری دس ہزار بتائی تو کسی نے یہ فرمایا کہ مجمع تو خیر بڑا تھا لیکن سادہ لوح کسان فلمی ستاروں اور گانے بجانے کے لالچ میں آئے تھے، انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ سیاسی جلسہ ہے۔ گواہ اور شہادت کی غیر موجودگی میں اس نوع کا جھوٹ چل بھی جاتا ہے۔ لیکن ایک لاکھ سے زائد عینی گواہوں کو جھٹلانے کی کوشش محض اس پریشانی اور بوکھلاہٹ کا

ثبوت ہے جو اس مکتبِ فکر کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس سے یقیناً لاحق ہوئی ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں پہلی بار کسی مقام پر کسانوں کا اتنا عظیم اجتماع ہوا۔ پہلی بار اتنے بڑے اجتماع کی تنظیم، ترتیب اور میزبانی کسی متمول سیاسی جماعت کے بجائے مقامی کسان کارکنوں اور ان کے ہمدردوں نے کی۔ پہلی بار مقامی کسانوں نے اس مقصد کے لیے ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں کی جماعت منظم کی۔ پہلی بار کسانوں، مزدوروں، دانشوروں، طلبہ، ادیبوں، صحافیوں، فنکاروں اور سیاسی جماعتوں کے سربرآوردہ ترجمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ ایک زمانے کے بعد ان سیاسی جماعتوں نے ایک کسان تنظیم کی دعوت پر اشتراکِ عمل اور تعاون کا ثبوت دیا جو باہمی اختلافات کے باوجود پسماندہ طبقوں کے حقوق اور خوش حالی کے لیے کوشاں ہیں۔ چنانچہ اس اجتماع میں نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں بازو، پیپلز پارٹی، جمعیت العلمائے اسلام، لیبر پارٹی، اسلام لیگ اور طلبہ کی مختلف جماعتیں شامل تھیں اور مندوبین خیبر سے لے کر چٹاگانگ تک ملک کے ہر حصے سے تشریف لائے تھے۔ کانفرنس کی کارروائی بیشتر اردو میں تھی اور تقاریر کا سلسلہ آٹھ گھنٹے تک مسلسل جاری رہا۔ اس کے باوجود ایک لاکھ سے زائد کسان نہایت توجہ، سکون اور دل جمعی سے کانفرنس کی کارروائی سنتے رہے، گانے بجانے کے رسیا اگر محض میلہ گھومنے آئے تھے تو دن بھر کس خوشی میں ہلکان ہوتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ اس کانفرنس کی عدیم المثال کامیابی میں کلام کی کوئی گنجائش ہے نہ اس کے منتظمین کے حسنِ کار، مقررین کے خلوص یا سامعین کے جوش و خروش میں۔ اس اجتماع سے یہ بھی واضح ہوا کہ سیاسی شعور اور بیداری اب محض شہروں کے لیے سفید پوش طبقوں کا اجارہ نہیں رہا۔ اب دیہات کی بے زبان مخلوق کو بھی احساس ہو چلا ہے کہ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ ایک اور اہم بات بھی سامنے آئی ہے کہ جو سیاسی جماعتیں جزوی طور پر ہم خیال ہونے کے

باوجود سیاسی پلیٹ فارم پر یکجا ہونے کو تیار نہیں ایک طبقاتی تنظیم کے پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوسکتی ہیں، اس طور سے اس کانفرنس نے محروم اور پسماندہ طبقوں کی ہمدرد جماعتوں میں اتحاد اور تعاون کی ایک نئی راہ پیدا کی جس میں تھوڑی سی استقامت بھی ہماری سیاسی زندگی کا رخ بدل سکتی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ کوئی ایک کانفرنس یا ایک اجتماع خواہ وہ کیسا ہی عظیم الشان اور کامیاب کیوں نہ ہو کسی مستقل تحریک یا تنظیم کا بدل نہیں ہوسکتا، اگر اس اجتماع کے نتیجے میں کوئی تحریک منظم نہیں ہوتی نہ کوئی تنظیم مرتب ہوتی ہے تو اس کی اہمیت گفتند و برخاستند سے زیادہ نہیں۔ کسی سیاسی محفل کی کامیابی کا معیار، رنگ محفل نہیں اس کے عملی نتائج ہیں۔ ہماری ملکی سیاست کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں جو لہریں بیدار ہوئی ہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کانفرنس سے ان کے خروش میں ضرور اضافہ ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ یہ اجتماع ایک دھارے کے بجائے محض حباب ثابت نہ ہو۔'' (۱۸)

فیض احمد فیض نے ''گھیراؤ جلاؤ'' کے عنوان سے مزدوروں کے حقوق کی حمایت میں اداریہ تحریر کیا:

'' 'گھیراؤ' اور 'جلاؤ' کے نعروں نے ان دنوں بہت شہرت پائی ہے۔ جب کسی کارخانہ میں مزدور ہڑتال کرتے ہیں اور کارخانہ کی انتظامیہ جوابی کارروائی کرتی ہے اور نوبت تصادم تک پہنچتی ہے اور انجام کار مزدور خاک و خون میں تڑپتے ہیں تو عوام دشمن جماعتوں کے عہدیدار، اپنی تقریروں اور بیانوں میں اور ان کے ماتحت اخبار، اپنی خبروں اور تبصروں میں ان تمام حشر سامانیوں اور ستم رانیوں کو ایک لفظ ''گھیراؤ'' میں سمو کر اپنی دیانت فکر اور آزادیٔ اظہار کا حق ادا کردیتے ہیں۔ اس وقت کہا یہ جاتا ہے کہ مزدوروں نے ''گھیراؤ'' کردیا اور بس ''جلاؤ'' کرنے والے تھے کہ پولیس نے ''گولی چلاؤ'' کردیا۔ غرض کہ ہڑتال سے پہلے کے مصائب ہوں تو ان کا مستحق مزدور، ہڑتال کرے تو

ذمہ داری مزدور پر، اس دوران میں انتقامی کارروائی کی جائے تو مزدوروں کی جان پر وہ بھی برحق اور اگر اس طرح کی کوششوں میں مزدور مزاحمت کرے تو گھیراؤ کرنے، لوٹ مار کرنے، کارخانہ کی املاک کو نقصان پہنچانے اور امن عامہ کے لیے خطرہ بن جانے کی ذمہ داری بھی مزدوروں پر ہی عائد ہوتی ہے۔

''جلاؤ اور گھیراؤ'' کے نعروں میں بڑے بڑے سرمایہ داروں، غیر ملکی کمپنیوں کے سربراہوں اور کارخانہ داروں کے لیے جو کشش موجود ہے وہ کچھ بے سبب نہیں۔ ادھر ہڑتال ہوتی ہے ادھر نالہ وشیون کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس میں ''گھیراؤ'' کی بازگشت دیر تک گونجتی رہتی ہے۔ مقصد یہ اعلان ہوتا ہے کہ مزدوروں نے گھیر رکھا ہے اور اب سرکاری انتظامیہ کا فرض ہے کہ سرمایہ داروں کا بچاؤ کرے اور ہڑتالیوں کو ان کی سرکشی کی سزا دے۔ یہ مطالبہ بالعموم پورا کر دیا جاتا ہے، البتہ ہمارے سامنے ایک مثال کراچی کے کارخانے کی ہے جس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کارخانہ دار کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بعد میں مجسٹریٹ کے فیصلے کی توثیق مغربی پاکستان کی ہائی کورٹ نے بھی کر دی۔

محنت کش طبقہ کے معاشی حقوق اور ایک عادلانہ معاشرہ کے قیام میں اس کی جدوجہد کو ناکام بنانے کے لیے سرمایہ دار یہی ظالمانہ طریقے اختیار کرتا ہے۔ بہر حال اب کہ عدالت عالیہ کے ایک فیصلہ سے ایک قانونی نقطہ کی صراحت ہوگئی ہے، ہم اپنی حکومت اور اس کے عمال سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مزدوروں کی قانونی جدوجہد میں رکاوٹ ڈالنے والے کارخانہ داروں کا سختی سے محاسبہ کرے تا کہ صنعتی امن بحال ہو اور مزدور عافیت کا سانس لیں۔'' (۱۹)

رسالے لیل و نہار کے اداریہ میں فیض نے ''وزارت یا سیاست'' کے موضوع پر اداریہ میں لکھا:

''آنے والے انتخابات کے بارے میں مارشل لاء حکومت نے من جملہ اور امور کے دو بنیادی اصول وضع کیے تھے، اوّل یہ کہ انتخابات قطعی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے اور ان میں ریاستی اداروں یا انتظامیہ کی جانب سے کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ دوئم یہ کہ کسی جماعت یا گروہ کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ کسی دوسری جماعت، گروہ یا فرد کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں ناشائستہ اور ناجائز تنقید یا بہتان طرازی اور دشنام دہی سے کام لے، اس دوسرے اصول کی خلاف ورزی تو جبھی شروع ہوگئی تھی جب بعض ثقہ جماعتوں اور ان کے سربراہوں نے اپنے حریفوں کو کافر، غدار اور غیر ملکی ایجنٹ قرار دینا روزمرہ کا شعار ٹھہرالیا تھا۔ اب اس پہلے اصول کے بارے میں بھی کھلم کھلا شک وشبہ کا اظہار کیا جانے لگا ہے، ان شکوک وشبہات کا تعلق صدر مملکت کی ذات یا حکومت کی صفات سے نہیں بلکہ بعض وزرائے کرام کے اقوال وافعال سے ہے۔''(۲۰)

فیض نے آئین بنانے اور اس کی منظوری اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں ''جمہوریت اور سلطانی جمہور'' کے موضوع پر لکھا:

''پاکستان کی سیاسی زندگی کا پہلا نصف حصہ ایک طرح کے جمہوری یا پارلیمانی نظام کے تحت گزرا۔ اس دور میں منتخب شدہ قومی اور صوبائی اسمبلیاں بھی موجود تھیں اور اکثریتی جماعتوں کی نامزد کردہ وزراتیں بھی، ان اداروں نے پاکستانی عوام کی کس درجہ خدمت کی، ان کے اراکین نے ہم تم اور میر صاحب کی نمائندگی کا حق کہاں تک ادا کیا، ان کی کارگزاری سے ہماری سماجی، معاشی اور اخلاقی زندگی میں کتنی اصلاح ہوئی اس کی سب سے بہتر شہادت یہی ہے کہ جب جنرل اسکندر مرزا مرحوم اور فیلڈ مارشل ایوب نے کسی سے پوچھے بغیر اس نظام پر شب خون مارا اور سارے قانون دستور پر سیاہی پھیر دی تو الّا ماشاء اللہ کسی نے اُف تک نہ کی بلکہ اس کے برعکس وزیروں، سفیروں اور آئینی

ایوانوں کی ہجویں لکھی گئیں اور فقرے کسے گئے۔

ہماری سیاسی زندگی کا دوسرا نصف حصہ کچھ سابق صدر ایوب خان کی فوجی آمریت اور باقی ان کے ایجاد کردہ ''بنیادی جمہوری'' نظام کے تحت گزرا۔ اس دور میں قوم کے دل و جاں پر جو کچھ گزری اس کا اظہار پاکستان کے شرق و غرب میں باران خون اور طوفانِ غیض وغضب کی صورت میں ہوا۔ ان دنوں اہل وطن کی نگاہیں ایک تیسرے دور کی صبح کے انتظار میں افق پر جم رہی ہیں اور اس افق پر ہمارے آئینی مستقبل کے دھندلے سے نقوش دکھائی دینے لگے ہیں۔ صدر پاکستان کی حالیہ تقریر اور آئین سازی کے قانونی ڈھانچے میں جو تجاویز اور ضوابط بیان ہوئے ہیں ان پر دو طریقوں سے غور کیا جاسکتا ہے۔ اوّل ان عام جمہوری نظریات اور رسم و رواج کی روشنی میں جن سے بدیسی جمہوری ملک آشنا ہیں اور دوئم اپنے مخصوص عملی سیاسی مسائل اور گذشتہ بیس بائیس سال کے عملی قومی تجربے کی روشنی میں۔''(۲۰)

دسمبر 1970 کے انتخابات کے بعد منتخب ہونے والی جماعتوں عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور فوج کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو ''بعداز یں تدبیر ما'' کے عنوان سے لکھا گیا:

''تئیس سال کے بعد پاکستان میں پہلی بار قومی سطح پر عام انتخابات منعقد ہوئے۔ پہلی بار عوام کی منتخب کردہ ایک آئین ساز اسمبلی وجود میں آئی۔ پہلی بار عوام نے پرانے سیاسی اجارہ داروں سے گلوخلاصی حاصل کی اور ملک کے دونوں حصوں میں اپنی پسند کے نمائندے منتخب کیے جو شخصی آزادی، جمہوری حقوق، معاشی انصاف اور عوام کی حاکمیت کے وکیل تھے۔ دونوں جانب کے عوام توقع رکھتے تھے کہ جس جرأت، دیانت اور فراست سے ان کے رہنما اپنے فرائض سرانجام دیں گے وہ اس دن کے لیے چشم براہ تھے جب ایک جمہوری اور منصفانہ آئین کی تشکیل کے بعد عوامی رہنما عوامی مصائب و آلام کے مداوا کے لیے ایفاء عہد کا آغاز کریں گے اور اب صورت یہ ہے کہ قومی

آ ئین ساز ایوان کے دروازے کھلنے سے پہلے مقفل کر دیئے گئے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ دوبارہ کب کھلیں گے۔''(۲۲)

جب جنرل یحییٰ خان کے دور میں لیل ونہار کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا تو اس وقت لینن امن ایوارڈ یافتہ فیض احمد فیض نے اداریہ لکھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک میں انتخابات ہونے والے تھے پھر انتخابات کے بعد ایک نیا سیاسی منظر نامہ اُبھر کر سامنے آیا۔ اس وقت جماعت اسلامی، نظریہ پاکستان اور اسلامی نظام کے نعرے قائداعظم سے منسوب کر رہی تھی۔ جنرل یحییٰ خان کے وزیر اطلاعات شیر علی خان بھی اس نظریہ کی ترویج کر رہے تھے۔ فیض نے ''پھر یہ ہنگامہ اے خیال کیا ہے'' کے عنوان سے اداریہ لکھا:

''صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں کہا کہ حکومت کی نظر میں نظریہ پاکستان کو کسی سیاسی جماعت سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ نہ وہ کسی جماعت کو پاکستان آئیڈیالوجی کا مخالف تصور کرتے ہیں۔ مروجہ قانون یہ ہے کہ اسلامی معتقدات اور ملکی سالمیت کے خلاف ہر نوع کی کارروائی قابل تعزیر ہے اور جو فرد یا جماعت ایسا اقدام کرے قابل مواخذہ ہے۔ ملک میں مختلف سیاسی جماعتوں کا وجود بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ دینی یا سیاسی اعتبار سے ان میں سے کسی کا مسلک قابل گرفت نہیں۔

رائے عامہ کی شہادت یہ ہے کہ پاکستان کے شرق وغرب میں سبھی جماعتوں کے ان گنت حامی موجود ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ مدعی کچھ ہی کہیں ہماری آبادی کا اکثر حصہ کسی جماعت کو خلاف اسلام یا وطن دشمن ماننے کو تیار نہیں۔ سب سیاسی جماعتوں کے منشور اور ان کے رہنماؤں کے اعلانات سب اس پر گواہ ہیں کہ نہ ان میں سے کوئی اسلام سے منحرف ہے نہ وطن کی سالمیت سے انکاری، جو جماعتیں کسی نہ کسی رنگ میں سوشلزم یا معاشی مساوات پر زور دیتی ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ احترام دین اور حب وطن کی بھی تلقین کرتی ہیں اور جن جماعتوں کو مبلغ دین ہونے کا دعویٰ ہے وہ اب کسی نہ کسی رنگ میں سرمایہ داری،

جاگیرداری اور معاشی عدم مساوات کی مذمت بھی کرنے لگی ہیں۔

اس صورتحال میں اسلام پسند اور غیر اسلام پسند کی بحث کیوں جاری ہے اور نظریہ پاکستان کی حمایت یا مخالفت کے بارے میں ہنگامہ ہے کیوں برپا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ نظریہ پاکستان کو (جس میں دین و وطن دونوں کا تحفظ شامل ہے) قدر مشترک تسلیم کر کے انتخابات اور ملک کے سیاسی مستقبل کے بارے میں خارج از بحث قرار دے دیا جائے تا کہ سیاسی جماعتوں کی جانچ پرکھ ان کے عملی قول و فعل کی روشنی میں کی جاسکے۔ اگر یہ ممکن ہے اور یقیناً ممکن ہے تو پھر وہ کون سی جماعتیں ہیں جو یہ بحث اور یہ ہنگامہ جاری رکھنے پر مصر ہیں اور کیوں؟'' (۲۳)

جنرل یحییٰ خان نے اقتدار میں آ کر عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا تھا۔ پھر انتخابات کی تاریخ میں دو مہینے توسیع کی اور دسمبر 1970 میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرانے کا فیصلہ ہوا۔ فیض نے ''انتخابات کا التواء'' کے عنوان سے لکھا:

''ہم تشنہ لبان پاکستان 23 سال سے جمہوریت کی دو بوندوں کو ترس رہے ہیں۔ ہمارے ہونٹوں کی تشنگی سے راوی اور پدما میں تلاطم برپا ہے اور ایوان اقتدار کے در و بام لرزاں ہیں لیکن قدرت کی ستم ظریفیاں ہنوز ہمارے صبر و تحمل کا امتحان لینے پر تلی ہوئی ہیں۔ مے خانے میں خم کی قطاریں لگی ہیں، صراحیاں رقص کر رہی ہیں اور پیمانے گردش میں ہیں مگر وہ شے نہیں آتی جس سے دل کی آگ بجھے اور آرزو کی بے قراریوں کو قرار آئے۔ بادل گھر کر آتے ہیں، بہار کا سماں بندھتا ہے لیکن ابھی پیاسوں کے لب بھیگنے نہیں پاتے کہ محفل درہم برہم ہو جاتی ہے اور مے خانہ ماتم خانہ بن جاتا ہے۔ سیلِ رواں کے تھپیڑے امیدوں پر پانی پھیر دیتے ہیں اور پھر وہی تشنہ لبی، پھر وہی سمندر سے شبنم کی التجاء پھر وہی انتظار کی گھڑیاں، طویل، تیرہ و تار۔'' (۲۴)

دسمبر 1970 کے انتخابات کے بعد مغربی پاکستان کے اخبارات میں سندھ اور پنجاب

سے منتخب ہونے والی جماعت پیپلز پارٹی کے خلاف مہم شروع ہوئی تو فیض نے اپنے اداریہ ''پیپلز پارٹی کے خلاف سرد جنگ'' میں لکھا:

''مغربی پاکستان کے سرمایہ دار، جاگیردار اور دیگر رجعت پسند عناصر ان دنوں پیپلز پارٹی کے خلاف ایک نئے انداز میں صف آراء ہو رہے ہیں اور اقتدار کے ایوان میں چور دروازے سے داخل ہونے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ وہ جماعتیں جو کل تک عوامی لیگ کو نظریہ پاکستان کا دشمن کہتے نہیں تھکتی تھیں اب عوامی لیگ کی حب الوطنی کے گن گا رہی ہیں۔ وہ لوگ جو کل تک شیخ مجیب الرحمٰن کو کافر اور ملحد قرار دے رہے تھے اب ان کو اسلام پسندی کا تمغہ پیش کر رہے ہیں۔ وہ حضرات جن کا کل تک دعویٰ تھا کہ عوامی لیگ کے چھ نکات پاکستان کی وحدت اور سالمیت کی نفی ہیں آج انہی نکات کی اعلانیہ ثنا خوانی کر رہے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو یہ باور کرانے کی کوشش ہو رہی ہے کہ مغربی پاکستان میں آپ کے سچے حلیف ہم ہیں اور آپ کا سب سے بڑا حریف ذوالفقار علی بھٹو ہے، لہٰذا بھٹو کے بجائے ہم سے سمجھوتہ کیجیے۔ عوامی لیگ کی شاخیں کھولی جا رہی ہیں اور عوامی لیگ کے حق میں بیانات شائع کیے جا رہے ہیں۔ دائیں بازو کے اخباروں میں جو خبریں اور تبصرے چھپ رہے ہیں ان میں بھی عوامی لیگ کی ثنا خوانی اور پیپلز پارٹی کی مذمت کا پہلو نکلتا ہے۔ ایک خبر رساں ایجنسی جس نے اسلام پسندوں کی خدمت اور جمہوری قدروں کی پامالی میں بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں ان دنوں عوامی لیگ کی کاسہ لیسی میں بہت پیش پیش ہے۔ چنانچہ اس نے ڈھاکے سے یہ خبر نشر کی ہے کہ مغربی پاکستان سے منتخب ہونے والے نیشنل اسمبلی کے ستّر ارکان عوامی لیگ سے تعاون کے لیے سخت بے چین ہیں۔ اسی طرح پیپلز پارٹی کے اندر پھوٹ کی من گھڑت خبریں بھی آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے بہت سے ارکان پارٹی چھوڑنے

کی سوچ رہے ہیں۔ایک آدھ بیان میں یہ اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ اب کالعدم ہو چکا ہے لہٰذا اسمبلی کا جو رکن چاہے اپنی پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی میں شامل ہو سکتا ہے۔شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مبینہ اختلافات کا تذکرہ اس پر مستزاد ہے۔غرضیکہ اس بات کی ان تھک کوشش ہو رہی ہے کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہونے پائے بلکہ بدگمانیاں اور غلط فہمیاں برابر بڑھتی چلی جائیں۔مگر سوال یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں اور ان کی سیاسی جماعتوں مسلم لیگ، پی ڈی پی اور جماعت اسلامی وغیرہ کو ان حرکتوں سے کیا فائدہ پہنچنے کی توقع ہے اور وہ پیپلز پارٹی سے کیوں اس درجہ خفا یا خائف ہیں کہ عوامی لیگ سے تعاون کی کوشش کر رہی ہیں۔" (۲۵)

حوالہ جات

۱۔ سید حسن سبط، پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل، مکتبہ دانیال، کراچی، صفحہ 8

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ناز ڈاکٹر احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ 186

۵۔ سید حسن سبط، پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل، مکتبہ دانیال، کراچی، صفحہ 278

۶۔ ایضاً، صفحہ 92

۷۔ ایضاً، صفحہ 99

۸۔ ایضاً، صفحہ 114

۹۔ ایضاً، صفحہ 29

۱۰۔ ایضاً، صفحہ 71

۱۱۔ ایضاً، صفحہ 51

۱۲۔ ایضاً، صفحہ 42

۱۳۔ ایضاً، صفحہ 114

۱۴۔ ایضاً، صفحہ 74

۱۵۔ ایضاً، صفحہ 242

۱۶۔ احمد سلیم، موج زر، نگارشات لاہور، صفحہ 46

۱۷۔ ایضاً، صفحہ 113

۱۸۔ ایضاً، صفحہ 110

۱۹۔ ایضاً، صفحہ 112

۲۰۔ ایضاً، صفحہ 40

۲۱۔ ایضاً، صفحہ 57

۲۲۔ ایضاً، صفحہ 65

۲۳۔ ایضاً، صفحہ 61

۲۴۔ ایضاً، صفحہ 50

۲۵۔ ایضاً، صفحہ 105

روز نامہ امروز

روز نامہ امروز 4 مارچ 1948 کو شائع ہونا شروع ہوا۔ امروز پاکستان ٹائمز کی عمارت میں منتقل ہوا۔ فیض احمد فیض چیف ایڈیٹر اور مولانا چراغ حسن حسرت کو ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ چراغ حسن حسرت ایک تجربہ کار صحافی تھے۔ انہوں نے 1920 میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ لکھنؤ، کلکتہ، سنگاپور اور لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات میں کام کیا۔ حسرت کو ایک مزاح نگار کی حیثیت سے جو شہرت ملی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ حسرت جب برطانوی فوج کے تعلقات عامہ کے شعبے سے منسلک تھے تو انہوں نے انگریزوں سے اخبار کی نئی ٹیکنیک سیکھی۔ خبر، اس کا لے آؤٹ اور تصویر کی اشاعت جیسے معاملات پر دسترس حاصل کی۔ یوں حسرت کی قیادت میں امروز کے نام سے ایک جدید اخبار تخلیق ہوا۔ حسرت نے نئی نسل پر اعتماد کیا۔ سب ایڈیٹر اور رپورٹروں کے لیے نوجوانوں کو موقع دیا گیا۔ یوں اخبار نظریات، سماجی ایجنڈا اور معیار کے اعتبار سے مضبوط حیثیت میں سامنے آیا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے 1951 میں روز نامہ امروز سے علیحدگی اختیار کرلی۔ 8 صحافی بھی ان کے ساتھ امروز سے علیحدہ ہوگئے جن میں معروف صحافی ادیب احمد بشیر بھی شامل تھے۔(۱)

پھر طفیل احمد خان ایڈیٹر بن گئے۔ 1953 میں معروف ادیب و شاعر انجمن ترقی پسند مصنفین کے رہنما احمد ندیم قاسمی اخبار کے ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ انہوں نے 1959 میں جنرل ایوب خان کی حکومت کے پی پی ایل اخبارات پر جابرانہ حملے کے خلاف استعفیٰ دیدیا۔(۲)

احمد ندیم قاسمی کے ایڈیٹر بننے کے بعد حمید اختر اور خواجہ اسلم کاشمیری نے امروز میں شمولیت اختیار کی۔ پھر کچھ عرصے بعد نوجوان صحافی مسعود اشعر اور منیر احمد قریشی نے بھی امروز میں شمولیت اختیار کی۔ منیر احمد قریشی منو بھائی کے نام سے مشہور ہوئے اور آج بھی وہ اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔ 1956 میں اکمل علیمی رپورٹر کی حیثیت سے امروز کی ٹیم میں شامل

ہوئے۔اسلم کاشمیری چیف نیوز ایڈیٹر کے عہدے تک پہنچے۔اسلم کاشمیری کئی صلاحیتوں کے مالک تھے۔وہ ایک اچھے مترجم، بہادر صحافی اور زبان پر مہارت کی خصوصیت رکھتے تھے۔کاشمیری سنجیدہ آرٹیکل اور مزاحیہ تحریر لکھنے کا ملکہ رکھتے تھے۔مسعود اشعر نے پہلے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر احمد ندیم قاسمی نے ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا۔مسعود اشعر نے فلموں پر جاندار تبصرے، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو ایک نئے انداز میں کور کرنا شروع کیا۔(۳)

مسعود اشعر نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ ابتدائی دور میں آئی اے رحمٰن پاکستان ٹائمز سے، مسعود اشعر امروز سے، علی صفیان آفاقی روزنامہ آفاق کی نمائندگی کرتے ہوئے فلمی دنیا کی سرگرمیوں کو کور کرتے تھے پاکستان ٹائمز اور امروز پہلے اخبارات ہیں جہاں فلمی دنیا کی سنجیدگی سے کوریج شروع ہوئی۔مسعود اشعر ایک طویل عرصے تک امروز ملتان ایڈیشن کے ایڈیٹر رہے۔انہیں جنرل ضیاء الحق کے دور میں کالونی ٹیکسٹائل ملز پر ہونے والی پولیس فائرنگ کی خبروں کی اشاعت پر معزول کیا گیا تھا۔بعد میں امروز کے صحافیوں کے احتجاج پر وہ بحال ہوئے۔(۴)

پاکستان کے نامور خطاط حافظ ایم یوسف نے امروز کی لوح تیار کی تھی۔اخبار میں عزیز اور قاضی اسلم کے کارٹون شائع ہوتے تھے۔چراغ حسن حسرت کے دور میں امروز میں ایک طاقتور ادارتی ٹیم موجود تھی جس میں ایوب احمد کرمانی، طفیل احمد خان، طفیل احمد جمالی اور عبدالشکور احسن شامل تھے۔ایوب احمد کرمانی اداریے تحریر کرتے، بائیں بازو کے دانشور محمد سرور جنہیں سیاسی امور پر کمانڈ تھی وہ بھی اداریے تحریر کرتے، طفیل احمد جمالی سنجیدہ اور مزاحیہ کالم لکھتے تھے جبکہ طفیل احمد خان اقتصادی مسائل پر لکھنے میں ماہر تھے۔احمد ندیم قاسمی جب ایڈیٹر بنے تو ظہیر بابر اور حمید جہلمی نے ادارتی سیکشن سنبھال لیا تھا۔حمید جہلمی نے 1948 میں امروز میں شمولیت اختیار کی اور نومبر 1991 تک امروز سے منسلک رہے۔جہلمی صاحب ایک پروفیشنل صحافی تھے۔(۵)

حمید ہاشمی نے حسرت کے زمانے میں امروز میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔انہیں 1952 میں نیوز ایڈیٹر کے عہدے پر ترقی دی گئی 1965 میں قاہرہ میں پی آئی اے کے طیارے کے حادثے میں حمید ہاشمی جاں بحق ہوئے۔حمید ہاشمی بائیں بازو کے فعال کارکن تھے۔وہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) کے بانیوں میں سے ایک

تھے۔ ابتدائی دنوں میں وہ پاکستان ٹائمز میں اور امروز کے لیے کام کرتے تھے۔ عبداللہ ملک نے 1951 میں امروز میں شمولیت اختیار کی۔ انہیں 1952 میں چیف رپورٹر بنایا گیا۔ عبداللہ ملک بائیں بازو کے معروف دانشوروں میں شامل تھے۔ انہوں نے کئی سیاسی تحریکوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔(۶)

ان کا شمار باخبر رپورٹروں میں ہوتا تھا۔ عبداللہ ملک کا کالم ''یہ لاہور ہے'' تاریخ کے واقعات سے پر ہوتا تھا۔ عبداللہ ملک نے بہت سی کتابیں تحریر کیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین جو بائیں بازو کے ادیبوں کی نمائندہ تنظیم ہے کے تین اہم ترین ارکان احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک اور حمید اختر امروز سے منسلک تھے۔(۷)

اخبار نے اپنے اداریوں اور آرٹیکل میں مظلوم عوام کے لیے بھرپور آواز اٹھائی، خاص طور پر ٹریڈ یونین، کسانوں، طلبہ اور خواتین کی تحریکوں کو بھرپور کوریج دی گئی۔ ریاستی جبر کا شکار ہونے والے بائیں بازو کے سیاسی کارکنوں، طالب علموں اور مزدوروں وغیرہ کی خبریں امروز میں شائع ہوتی تھیں۔ پھر سامراج دشمن تحریکوں کو خوب تفصیل سے شائع کیا جاتا۔ پاکستان میں جمہوری اداروں کے استحکام، عوام کے تعلیم، صحت اور ووٹ کے حق کے بارے میں آرٹیکل اور اداریے شائع ہوتے۔ سرحد، بلوچستان، سندھ اور مشرقی پاکستان کے عوام کے احساس محرومی، ان کی زبان اور ثقافت کے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں امروز میں خبریں شائع ہوتیں، کالم لکھے جاتے اور اداریے تحریر کیے جاتے۔(۸)

روزنامہ امروز نے 1949 میں قرارداد مقاصد کی منظوری کے منفی اثرات پر اداریے تحریر کیے۔ ایک اداریے میں سوال اٹھایا گیا کہ پاکستان کو جمہوری ریپبلک قرار دیا جائے۔ امروز میں قرارداد مقاصد پر آئین ساز اسمبلی میں ہونے والی بحث کے تناظر میں کئی آرٹیکل اور اداریے شائع کیے گئے جن میں ریاست کے سیکولر کردار اور تمام شہریوں کو بغیر امتیاز کے یکساں سلوک کی اہمیت کو پیش کیا گیا تھا۔ امروز نے ہمیشہ صوبائی خودمختاری کی حمایت کی اور اس بات پر زور دیا کہ صوبوں کو مکمل حقوق دے کر ملک کو مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ روزنامہ امروز نے ون یونٹ کے بننے کی شدید مخالفت کی۔ امروز نے لکھا کہ حکومت وفاق کی بنیاد پر بنی چاہیے۔ اس طرح امروز نے فضل الحق

کی حکومت کی برطرفی کو انتہا پسندانہ اقدام قرار دیا۔(۹)

روز نامہ امروز کے پبلشر امیر حسین نے 16 نومبر 1957 کو پشاور سے امروز کا ایک ایڈیشن شائع کرنے کے لیے درخواست دی۔ یہ درخواست سیکیورٹی کلیئرنس کے لیے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھجوادی گئی۔ پشاور کے سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس نے اپنے خط میں امروز کو شائع ہونے کی اجازت نہ دینے کی سفارش کی۔ متعلقہ پولیس افسر نے لکھا کہ امیر حسین میاں افتخار الدین کے قریبی ساتھ ہیں۔ میاں افتخار الدین کا تعلق نیشنل عوامی پارٹی سے ہے جن پر کمیونسٹ ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے اور ان کا مقصد اس پسماندہ علاقے میں کمیونسٹ پروپیگنڈا کرنا ہے۔ اکتوبر 1958 میں ملک پر مارشل لاء مسلط کر دیا گیا۔ انور علی کا ایک کارٹون پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا۔ مارشل لاء حکام نے انور علی کو طلب کیا اور ذہنی تشدد کیا۔ انور علی نے مارشل لاء حکام کے سامنے وضاحت کی، یوں انور علی کو گھر جانے کی اجازت دیدی گئی۔(۱۰)

امروز کے سابق ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی نے 1991 میں ایک انٹرویو میں جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے دباؤ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وزارت اطلاعات نے مارشل لاء اللہ کی رحمت کے عنوان سے ایک آرٹیکل امروز کے ایڈیٹر کو بھیجا۔ یہ آرٹیکل شائع نہ ہوا تو وزیر اطلاعات نے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ایک ٹیلی فون آیا، مجھ سے پوچھا گیا کہ آدمی بھیج دیئے؟ انہوں نے آدمی بھیج دیا۔ میں نے آرٹیکل اس کے حوالے کیا۔ پھر دوسرا آدمی آ گیا جس کے پاس میرے وارنٹ گرفتاری تھے۔

پھر فروری 1959 کو وفاقی وزراء بریگیڈ ایف آر خان اور ذوالفقار علی بھٹو کی نگرانی میں آپریشن شروع ہوا۔ پی پی ایل کی عمارت کو فوجیوں اور پولیس نے قبضے میں لے لیا۔ ذوالفقار علی بھٹو رات گئے مظہر علی خان کے گھر گئے اور ان پر زور دیا کہ وہ مستعفی نہ ہوں مگر صبح اٹھتے ہی مظہر علی خان نے استعفیٰ دیدیا۔(۱۱)

روز نامہ امروز کے چیف ایڈیٹر فیض احمد فیض اور پبلشر امیر حسین شاہ کو 12 مئی 1948 کو روز نامہ امروز میں شائع ہونے والی خبر پر پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ یہ خبر سی آر ڈی کے ڈی ایس پی محمد حسین کے بارے میں تھی مگر یہ خبر ایک خبر رساں ایجنسی اے این پی نے

جاری کی تھی۔فیض احمد فیض اور امیر حسین شاہ کو لاہور کے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ معروف وکیل محمود علی قصوری، فیض احمد فیض اور امیر حسین شاہ کی پیروی کے لیے عدالت میں پہنچے۔ مجسٹریٹ نے فیض کو ضمانت پر رہا کرنے کی پیشکش کی مگر فیض احمد فیض نے ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کرتے ہوئے مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا جس پر محمود علی قصوری فیض کی پیروی سے دستبردار ہو گئے مگر فیض احمد فیض اور امیر حسین شاہ کو شام کو رہا کر دیا گیا۔ یوں فیض احمد فیض ملک کے پہلے صحافی تھے جو گرفتار ہوئے۔(۱۲)

امروز، پاکستان ٹائمز اور ہفت روزہ لیل ونہار کو سرکاری تحویل میں لیا گیا تو ان کی پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں آ گئیں مگر امروز کے صحافیوں نے آزادیٔ صحافت، جمہوری نظام کے قیام اور بنیادی حقوق کے بارے میں کوششیں جاری رکھیں۔ پھر عوامی مسائل پر خصوصی توجہ دی گئی۔ جب فوجی آمر جنرل ایوب خان کے خلاف 1968 میں عوامی تحریک شروع ہوئی تو روزنامہ امروز پھر اپنی پرانی روش پر آ گیا۔اس زمانے میں ظہیر بابر امروز کے ایڈیٹر تھے۔امروز نے ایوب حکومت کے خلاف مختلف شہروں میں چلنے والی تحریکوں اور پولیس کے بہیمانہ تشدد کے بارے میں خبریں اور تصاویر وغیرہ بھرپور طریقے سے شائع کیں۔ جب ہنگاموں کے دوران کراچی اور لاہور میں کرفیو کا نفاذ ہوا تو امروز نے اس صورتحال کو تفصیل سے کور کیا جس پر متعلقہ شہروں کے ڈپٹی کمشنروں نے امروز کو نوٹس جاری کیے۔امروز نے 1970 کے انتخابات میں ترقی پسند سیاسی جماعتوں کی حمایت کی۔(۱۳)

روزنامہ امروز کا پہلا اداریہ اخبار کے چیف ایڈیٹر فیض احمد نے لکھا تھا۔اس میں ''ہم اور آپ'' کے عنوان کے تحت اخبار کا جو مقصد بیان کیا گیا وہ یہ ہے:

''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین اپنے دیس اور باقی دنیا کے حالات کا صحیح اور بے لاگ اندازہ کر سکیں۔اس لئے کسی خاص عقیدہ یا نکتہ نظر کو ان پر ٹھونسنے کے لئے خبروں میں ملمع اور رنگ سازی سے احتراز کیا جائے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں دنیا کی کوئی قوم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چن کر بسر اوقات نہیں کر سکتی۔اس لئے پاکستان کے عوام کو اپنے مسائل اور سیاسی ممالک کو ایک حد تک باقی دنیا کے مسائل اور ممالک سے منطبق کرنا ہوگا۔اس لئے دنیا کے بدلتے ہوئے سیاسی نقشہ پر

ان کی نظر جمی رہنی چاہیے۔

ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی سب سے بڑی دولت ہمارے وسیع میدان، فلک آشنا پہاڑ، ہمارے لہلہاتے کھیت، دریا، مدفون معدنیات یا معلوم دنیائے ذخائر نہیں بلکہ ہمارے عوام ہیں۔ پاکستان کی عظمت اور خوشحالی کا وارث اوّل بھی انہیں کو ہونا چاہیے، اس لئے لازم ہے کہ ہر سیاسی، سماجی یا اقتصادی مسئلہ کو انہی شاکر اور بے زبان عوام کی نظر سے دیکھیں اور ان کے مسائل لاتعداد ہیں۔ پاکستانی حکومت ہماری قومی حکومت ہے اس لئے آج کل سب لکھنے والوں کو ایک دوسری سفارت سپرد ہے۔ عوام کی سفارت حکومت کے ایوانوں میں اور حکومت کی سفارت عوام کی مجالس میں۔ اس سفارت میں تنقید کا حق بھی شامل ہے۔ کوئی سفیر یا کوئی نقاد اپنی ذات کو اپنے خیالات اور اعتقادات سے الگ نہیں کرسکتا۔ ہمیں بھی یہ دعویٰ نہیں ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ اوّل پاکستان کے عوام کے سیاسی اور جمہوری حقوق کا پورا تحفظ ہو اور دوئم پاکستان کے مادی ذرائع اور ذخائر کی پوری درآمد، اکتساب اور منصفانہ تقسیم کی جائے۔ یہی دونوں باتیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک داخلی اور خارجی طور پر امن و آشتی کی بنیادیں مستحکم اور مستوار نہ ہوں اور دنیا کا کوئی حصہ بدامنی اور خوف سے اس وقت تک محفوظ نہیں جب تک تمام اقصائے عالم میں، امن، آزادی اور جمہوریت کے دشمن مغلوب نہیں ہو جاتے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امروز کے اجراء کے اغراض و مقاصد وہی تھے جو ایک اچھے آزاد اور غیر جانبدار اخبار کے ہو سکتے ہیں لیکن بے زبان عوام کی خدمت، عوام کے سیاسی اور جمہوری حقوق کا پورا تحفظ اور دولت کی منصفانہ تقسیم ایسے مقاصد ہیں جن کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ ابتدائی اداریہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تینوں اصول امروز کی پالیسی کا سنگِ بنیاد تھے۔

امروز پاکستان میں پہلا اردو اخبار ہے جس نے عام لکھنے والوں کو ان کی شعری و نثری تخلیقات کا معاوضہ دینا شروع کیا۔ چنانچہ اس کا یہ اقدام بھی لکھنے والوں کو اس اخبار کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بنا۔ کم و بیش ملک کے تمام نامور ادیبوں، شاعروں اور اہل قلم کی نگارشات وقتاً

فوقتاً اس میں شائع ہوتی رہیں۔ اس اخبار نے خبروں تک کے معاملے میں اپنے قارئین کو بہت سی نئی چیزیں بھی دیں مثلاً گھوڑ دوڑ کے متعلق پیش گوئی کو خبروں کی صورت میں اور پھر گھوڑ دوڑ کا حال اور نتائج پہلی بار اسی اخبار میں چھپنے شروع ہوئے۔ اسی طرح ثقافت اور ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں بھی خبریں اور دوسرا مواد شروع دن سے ہی امروز میں نمایاں طور پر شائع ہونے لگا۔ گویا امروز نے ترقی پسند پالیسی کے طور پر پاکستان میں ثقافت اور ثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی اور فروغ کے لئے ان کو نمایاں طور پر چھاپنے کی روش اختیار کی۔ اس کے علاوہ امروز میں کمیونسٹ رہنماؤں، کمیونسٹ پارٹی اور نظام کے متعلق خبریں اور دوسرا مواد بھی شروع دن سے ہی نمایاں طور پر چھپنے لگا۔ (۱۴)

آزادیٔ صحافت

پاکستان سیکورٹی ایکٹ 1952 کا اطلاق 1955 میں جب اخبارات پر بھی کر دیا گیا تو اس کی رو سے حکومت کو اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اخبارات کو خبر کا ذریعہ (Source) بتانے پر مجبور کر سکے۔ دیگر اخبارات کی طرح امروز نے بھی اس کے خلاف ٹکر لی۔ امروز نے لکھا کہ ایک مقامی خبر رساں ایجنسی کے مالک کو سیفٹی آرڈیننس کے تحت گرفتار کیا جا چکا ہے اور ایک اخبار کے مالک اور مدیر پر مقدمہ چلانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ حکومت اگر اخبار نویسوں کے قلم پر پہرہ بٹھا دینا چاہتی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اجنبی حکومت بھی آزادیٔ فکر کو یونہی کچلتی رہی ہے۔ پاکستان کا کوئی اخبار ایسا نہیں جو مملکتِ پاکستان کا مخالف ہو اور اس کی وفاداری سے باہر قدم رکھنا چاہتا ہو۔ البتہ پاکستان کے اخبارات اپنے اپنے رجحانات کے مطابق حکومت کے نظام میں تبدیلی ضرور لانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کی آرزو ہے کہ اس سرزمین میں ایک ایسے نظامِ حکومت کی بنیاد ڈالی جائے جو ہمارے قومی مزاج سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکومت کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے کیونکہ اس میں اکثر ایسے لوگ ہیں جو ابھی کل تک اجنبی حکومت کے کارندے تھے۔ انہوں نے حکومت اور فرماں روائی کے گُر اپنے انگریز خداوندانِ نعمت سے سیکھے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان اجنبیت اور بیگانگی کا حجاب حائل ہے اور ضبط اور انضباط کے جس تنگ دائرے میں ہمیں محدود رکھنا چاہتے ہیں، کوئی

آزاد قوم اس میں مقید نہیں رہ سکتی۔(۱۵)

روزنامہ امروز نے آئین ساز اسمبلی کے ابتدائی اجلاسوں پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اپنی دوسری اشاعت میں لکھا کہ دستور سازی کرنے میں خواہ مخواہ کی تاخیر درست نہیں۔ دستور کسی ملک کی آزادی کا سب سے بڑا ضامن ہوتا ہے۔اس وقت ہم پر دستور سازی کے بھاری فرائض عائد ہوتے ہیں۔اخبار نے شروع ہی سے آئین سازی میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔اس کے پہلے شمارہ 4 مارچ 1948 کی شہ سرخی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے سے متعلق تھی۔ روزنامہ امروز نے سیکولرازم کو آئین کی ساکھ بنانے پر زور دیا۔

وزیراعظم لیاقت علی خان کی ایک تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار نے لکھا کہ وزیراعظم نے جن تمدنی اور ثقافتی قدروں کی بحالی اور جیسے طرزِ معیشت و معاشرت کے قیام کا ذکر کیا ہے اور جس اسلامی طرزِ زندگی کو مطمع نظر قرار دیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ آئین ساز اسمبلی اسے عملی جامہ پہنائے۔اخبار نے 8 دسمبر 1948 اور پھر 20 دسمبر 1948 کو آئین سازی اور آئین ساز اسمبلی کے زیرِ عنوان اداریے میں آئین سازی کا کام مستعدی اور تیزی سے مکمل کرنے کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا اور شکایت کی کہ جس تیزی سے کام ہونا چاہیے، ہو نہیں رہا۔فروری 1949 میں امروز نے آئے دن کے آرڈیننسوں کے پیش نظر آئین کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا کہ حکومت کی طرف سے کم از کم اخبارات کو یہ تو بتایا جاتا رہے کہ آئین کے سلسلے میں قائم کی گئی مختلف سب کمیٹیاں کیا کر رہی ہیں؟

اخبار میں آئینی امور سے متعلق خبریں اور مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے۔امروز نے 1956 کے آئین کی اس لیے مخالفت کی کہ اس میں بنیادی حقوق کا ذکر واضح انداز میں موجود نہیں ہے اور نجی ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔

قرارداد مقاصد پر امروز کا تبصرہ یہ تھا:

''ہم اسلام کے جمہوری اصولوں، مساوات، معاشی انصاف اور متوازن معاشرے کے تصور کو نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں لیکن ہمیں ان عناصر کی طرف سے اندیشہ ہے کہ جو کل تک برطانوی استعمار کو عین اسلامی اور ملک معظم کو 'ظلِ سبحانی'' قرار دیتے

تھے آج بھی معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی اور اقتصادی ڈھانچے میں اصلاح ان کو ناگوار ہیں۔ دراصل یہ عناصر ساری سوسائٹی کو گھن کی طرح کھائے جارہے ہیں اور آئندہ دستور کو مسخ کرنے کے لیے غیر جمہوری اور استبدادی طاقتیں انہیں آلہء کار بنائیں گی۔ لہٰذا اسلام اور اسلامی جمہوریت کی قطعی واضح اور صاف الفاظ میں جتنی زیادہ تشریح کی جائے، غلط فہمیوں اور گمراہ کن تاویلوں کے امکانات اسی قدر کم ہوتے جائیں گے۔ جب وزیراعظم صاحب کو اعتراف ہے کہ اسلام کلیسا کی سیادت یا رہبانیت کو تسلیم نہیں کرتا تو اس اصول کو قرارداد میں شامل کرنے میں کیا امر مانع ہے؟ جب اقتدار کا سرچشمہ جمہور ہیں تو یہ اعلان کرنے میں کیا حرج ہے کہ پاکستان ایک عوامی مملکت ہوگا۔''

حکومت پاکستان کی ہدایت کے مطابق 12 مارچ 1950 کو قرارداد مقاصد کے چارٹ بنوا کر سرکاری دفاتر میں لٹکا دیئے گئے تاکہ سرکاری اہلکاروں کو یہ بات یاد رہے کہ وہ ایک اسلامی حکومت کے ملازم ہیں۔ اس پر امروز کے مولانا چراغ حسن حسرت کا طنزیہ تبصرہ یہ تھا کہ:

''ہمارے نزدیک سرکاری دفتروں میں قرارداد مقاصد کے چارٹ لٹکا دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہونا چاہئے۔ مثلاً قرارداد مقاصد کے تعویز بچوں کے گلے میں لٹکائے جاسکتے ہیں۔ خاص خاص موقعوں پر یہ تعویز گھول کر پلا دینا بھی خاصا مفید ثابت ہوسکتا ہے بلکہ دفع آسیب کے لیے قرارداد مقاصد کی دھونی بھی دی جاسکتی ہے۔ اس قرارداد کو مرتب ہوئے سال بھر ہوگیا ہے لیکن تعجب ہے کہ کسی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا خیال نہیں آیا۔ قرارداد مقاصد 12 مارچ کو منظور ہوئی تھی اس لیے قرارداد شریف کی ختم شریف بھی اس تاریخ ہونا چاہیے اور اسے بارہویں شریف کا ختم کہنا چاہیے۔ ٹھیک ہے کہ جماعت اسلامی والے اس پر بھی مطمئن نہیں ہونگے لیکن اگر یہ وہابی قسم کے لوگ بارہویں شریف پر بھی مطمئن نہ ہوں تو انہیں مطمئن کرنے کی اور کیا صورت باقی رہ گئی ہے؟''

''جس وزیراعظم نے قرارداد مقاصد پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''خدا نے سوائے

جمہور کے کسی کو اختیارات نہیں سونپے''، اسی وزیر اعظم نے ریاستی عوام کی بجائے والیانِ ریاست کی حاکم و مقتدر یعنی اپنی اپنی ریاستوں کا ''ظلِ الٰہی'' منوانے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگالیا اور بالآخر پاکستان کے آئین میں ترمیم کروا کے ہی دم لیا۔ پاکستان کے آئین میں یہ ترمیم بھی کر لی گئی کہ حکومت ہر شہری کو مقدمہ چلائے بغیر قید کر سکتی ہے۔ آئین ساز اسمبلی سے یہ بھی منظور کروالیا گیا کہ پنجاب کی خالی نشستوں کو پُر کرنے کا اختیار صوبائی عوام کو نہیں بلکہ برسر اقتدار افراد ہی نامزد کریں گے۔ گویا ایک طرف تو حکومت نے خود ہی تسلیم کیا کہ خدا نے جمہور کو اختیارات سونپے ہیں اور دوسری طرف حکومت نے ہی جمہور کو ان اختیارات کے استعمال سے محروم بھی کر دیا۔''(۱۶)

بوگرا فارمولا

روز نامہ امروز نے بوگرا فارمولا میں ایوانِ بالا کے یونٹوں کو دی گئی نمائندگی کو عددی لحاظ سے کم اور انتہائی بے اثر قرار دیا۔ تاہم لکھا کہ جب تک فارمولے کو واضح نہیں کیا جاتا، اس وقت تک صحیح عوامی ردعمل سامنے نہیں آسکتا۔

ون یونٹ

روز نامہ امروز نے ون یونٹ کے منصوبے کی مخالفت کی اور اس رائے کا اظہار کیا کہ پاکستان جیسی جغرافیائی حیثیت رکھنے والے ملک میں فیڈریشن اور کنفیڈریشن کے امتزاج پر مبنی حکومت بنی چاہیے اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری ملنی چاہیے۔ بوگرا دور میں جب ون یونٹ کے منصوبہ پر بات شروع ہوئی تو امروز نے لکھا کہ پاکستان انتظامی ڈھانچہ تشکیل کرتے وقت مختلف یونٹوں کے جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور نسلی حقائق کو پیش نظر رکھے۔

ون یونٹ مقرر ہو جانے کے بعد بھی امروز نے اس پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور اسے مسائل کا غیر حقیقی حل قرار دیا اور لکھا کہ اس طرح جمہوری نظام مستحکم بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا۔ مغربی پاکستان کو جس انداز سے ایک انتظامی اکائی میں تبدیل کیا گیا اس سے بعض لوگ شکوک و شبہات کا شکار ہوئے ہیں۔

انتخابات میں تاخیر

امروز نے انتخابات کے انعقاد پر زور دیتے ہوئے لکھا کہ اس وقت عملاً گورنر راج نافذ ہے اور وزراء گورنر کے نامزد کردہ ہیں۔ خود گورنر صوبے میں کسی منتخبہ ادارے کے سامنے جوابدہ نہیں جس کی وجہ سے حکومت اور عوام کے درمیان ایک بہت بڑا خلاء موجود ہے۔ اخبار نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اس خلاء کو ایک بالواسطہ طور پر منتخب ہونے والی اسمبلی پُر سکتی ہے جس کی وجہ سے کم از کم ایک جمہوری روایت ضرور قائم رہے گی۔

اسمبلی کا توڑا جانا

امروز نے اسمبلی میں بوگرا فارمولا پیش ہونے اور آئین پر سب کا اتفاق رائے کے امکانات واضح ہو جانے کے بعد آئین ساز اسمبلی توڑ کر ایک نو منتخب اسمبلی سے اسے منظور کرانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ 24 اکتوبر 1954 کو گورنر جنرل غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ روز نامہ امروز نے لکھا کہ اگر مسلم لیگی رہنما عوام کے اس مطالبے پر پہلے ہی غور کرتے تو نئی آئین ساز اسمبلی کب کی منتخب ہو چکی ہوتی۔ نیا آئین بھی مرتب ہو گیا ہوتا۔ شک وشبہ اور مایوسی کی فضاء ختم ہو جاتی۔ اخبار نے جلد سے جلد عبوری دور ختم کر کے ملکی سیاست کو مستحکم جمہوری بنیادوں پر قائم کرنے اور ملکی باگ دوڑ عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔

مقدمہ مولوی تمیز الدین

آئین ساز اسمبلی ٹوٹنے کے بعد مولوی تمیز الدین نے سندھ ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کے بعد حکومت اور مولوی تمیز الدین وغیرہ کے درمیان سمجھوتے کی بات چلی تو امروز نے باہم تصفیہ کی تجویز کو سراہا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ اس طرح سے ایک انتہائی پیچیدہ مسئلہ کے حل کی بہترین راہ نکل آئی ہے اور ملک کو آمریت سے بچانے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔ اخبار نے واضح کیا کہ ملک میں عام انتخابات کے ذریعے اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے جلد سے جلد کر دینا ہی مسئلہ کا اصل حل ہے۔ اس کے بعد امروز نے فیڈرل کورٹ کی طرف سے آئین ساز

اسمبلی توڑے جانے کے فیصلہ کو درست قرار دینے پر لکھا کہ آپ کی حکومت کو اس کے علاوہ کچھ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک عبوری آئین ساز اسمبلی تشکیل دے اور صحیح معنوں میں نمائندہ اسمبلی کیلئے انتخابات کا جلد از جلد انتظام کرے۔(۱۷)

نئی آئین ساز اسمبلی

امروز نے آئین ساز اسمبلی کے امور میں ہر مرحلے پر گہری دلچسپی لی اور آئینی امور سے متعلق مختلف مکاتبِ فکر کا نکتہ نظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی طرف سے بھی مفید آراء و تجاویز دینے اور عوام الناس کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ 1955 کے اواخر میں آئین ساز اسمبلی کے ارکان کی عدم توجہی کے باعث اسمبلی کا کورم پورا نہ ہونے کی شکایات بار بار پیدا ہوئیں اور اسمبلی کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ امروز نے اس کا نوٹس لیا اور لکھا کہ اراکین کا یہ رویہ اس عام غیر ذمہ داری اور سہل انگاری کا مظہر ہے جو ہمارے قائدین گذشتہ آٹھ دس برس سے تقریباً تمام قومی معاملات میں برتتے چلے آ رہے ہیں۔ اس عدم دلچسپی کی بناء پر آئین کی فوری تکمیل کی امید موہوم ہے۔(۱۸)

کراچی میں جب جماعت اسلامی کے رہنما مولانا امین احسن اصلاحی نے اسلامی آئین کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ امریکہ اور برطانیہ اگر اشتراکیت کے خلاف ہمارا تعاون چاہتے ہیں تو ان کے نکتہ نظر سے بھی یہی بہتر ہوگا کہ پاکستان میں اسلامی دستور بنے اور نافذ ہو۔ اس بیان پر امروز نے تنقید کی اور لکھا کہ اس سے قطع نظر کہ اسلامی آئین کے متعلق جماعت اسلامی کے نظریات کیا ہیں اور متذکرہ بالا دلیل سے جو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں انہیں جماعت اسلامی کہاں تک اپنانے کے لیے تیار ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ایک سیاسی جماعت کے ایک ذمہ دار لیڈر کو اسلامی دستور کے نفاذ کے سلسلے میں امریکہ اور برطانیہ کی طرف دیکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور انہوں نے اشتراکیت کا ہوا دکھا کر امریکی برطانوی مدبروں کو ہمارے آئینی معاملات میں دخل دینے کی بالواسطہ طور پر دعوت کیوں دی؟(۱۹)

نئے آئین کے نفاذ کے بعد امروز نے جلد عام انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا اور لکھا کہ جلد

سے جلد عام انتخابات کروانے کے ابہام کو ختم کرے اور انتخابات کی ایک قطعی تاریخ مقرر کرے اور ملکی سیاست کا رخ ایوانوں کے بجائے عوام کی طرف پھیر دے۔ حکومت کا فرض ہے کہ نہ صرف انتخابات کی تاریخ کا تعین کرے بلکہ ایک ایسی فضاء بھی پیدا کرنے کی جدوجہد کرے جس میں انتخابات کی آزادی ممکن ہو۔ انتخابات کے لیے قطعی تاریخ کا اعلان کرنے کی ضرورت پر امروز نے متعدد اشاعتوں میں زور دیا اور اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ اگر ملک کو بے یقینی اور تشویشناک صورتحال سے نکالنا ہے تو پھر انتخابات کے لیے تمام ضروری انتظامات، احساس فرض، ذمہ داری اور دیانتداری کے ساتھ سرانجام دیئے جائیں تا کہ غیر ضروری تاخیر اور تساہل ملک کے مستقبل اور عوام کے اجتماعی مفاد کے لیے ضرر رساں ثابت نہ ہو۔ (۲۰)

ریپبلکن پارٹی کا قیام

امروز نے ریپبلکن پارٹی کے متعلق لکھا کہ جن وجوہ کی بناء پر یہ پارٹی وجود میں آئی ہے ان کی بناء پر کوئی بھی باشعور شہری اس سے فوری طور پر کوئی خوش فہمی وابستہ نہیں کر سکتا اور اس کے وعدوں اور اعلانات کی بجائے اس کے اعمال اور کارکردگی کا جائزہ لینا لازمی تصور کیا جائے گا۔ اخبار نے لکھا کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ کے 7 مسلم لیگی اراکین کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا۔ جوابی اقدام کے طور پر ڈاکٹر خان صاحب نے ریپبلکن پارٹی کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی ہے، جس کے دامن میں پہلے مسلم لیگ سے خارج کیے جانے والے وزراء نے پناہ لی ہے۔ اخبار نے واضح کیا کہ اختلافات کا سبب نہ تو اقتصادی پہلو ہے نہ اس سے مقتدر اقتصادی مسائل کا کوئی تعلق ہے جن میں زرعی اصلاحات، بے روزگاری، اقتصادی بدحالی، گرانی، عوام کا پست معیار زندگی اور روبہ زوال قوت خرید وغیرہ نمایاں ہیں۔ اس طرح یہ کشمکش سیاسی اور معاشی نظریات کے تصادم کا بھی نتیجہ نہیں اور ہنگامی قوانین کی بقاء جمہوری اقدار کی پامالی، شہری آزادیوں پر پابندی، تعلیم کی گرانی، محدود تعلیمی اور طبی سہولتوں وغیرہ سے کوئی بھی فریقین کے لیے کچھ تشویش انگیز نہیں۔ نئی جماعت میں شرکت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ ان کا مخالف دھڑا مسلم لیگ پر قابض ہے اس لیے وہ مسلم لیگ میں رہ کر مقتدر نہیں ہو سکتے۔ (۲۱)

مخلوط اور جداگانہ طریق انتخاب کا مسئلہ

اپریل 1956 میں آئین ساز اسمبلی نے مشرقی پاکستان کے لیے ایک انتخابی قانون منظور کیا جس میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر تمام اہم اقلیتوں کو اپنے نمائندے جداگانہ طور پر منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔ اس طریق انتخاب کی بالخصوص مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کی طرف سے سخت مخالفت کی گئی۔ امروز نے بھی مخلوط طریق انتخاب کی حمایت کی اور طریق انتخاب کے مسئلہ کو اسلام اور مذہب سے الگ ایک مسئلہ قرار دیا۔ اخبار نے لکھا کہ جداگانہ طریق انتخاب مخصوص حالات کی ضرورت تھا جواب نہیں رہا۔ اس طریقِ انتخاب کی حمایت کو اخبار نے بلاوجہ سادہ عوام کے مذہبی جذبات کو اُبھارنے کی کوشش قرار دیا۔ امروز کے ناقدین نے الزام لگایا کہ اس اخبار نے اپنی مخصوص پالیسی کے پیش نظر ایک سیکولر کردار ادا کیا جبکہ دوسرے کئی اخبارات نوائے وقت، کوہستان اور آفاق وغیرہ نے جداگانہ طریق انتخاب کی حمایت کی۔ (۲۲)

لسانی تنازعہ

مسلم لیگ اردو کو قومی زبان بنانا چاہتی تھی لیکن بنگالیوں کا مطالبہ تھا کہ بنگلہ کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ بالخصوص مغربی پاکستان کے رہنما ایک سے زائد زبانوں کو قومی زبان بنائے جانے کو قومی یکجہتی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں اوائل 1948 میں بنگالی طلبہ نے بنگلہ کو قومی زبان بنانے کے حق میں مظاہرے کیے۔ انہیں بعض سیاست دانوں کی تائید بھی حاصل تھی۔ قائداعظم نے اس موقع پر بیماری کے باوجود ڈھاکہ جا کر انہیں سمجھایا کہ ان مشکل حالات میں اس مسئلے کو نہ اٹھائیں۔ قائداعظم نے واضح کیا کہ پاکستان کی واحد زبان صرف اور صرف اُردو ہوگی۔

اوائل 1952 میں خواجہ ناظم الدین نے وزیراعظم کی حیثیت سے ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں اعلان کیا کہ صرف اردو ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اسے پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ اس پر دبا ہوا لسانی مسئلہ پھر زندہ ہوگیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے فوری طور پر جلسہ کر کے اردو سے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ جناح عوامی لیگ کے لیڈر مولانا بھاشانی اور متحدہ بنگال مسلم لیگ کے

سابق سیکریٹری جنرل ابوالہاشم نے بھی طلبہ کی حمایت کی۔ پاکستان آبزرور ڈھاکہ نے لکھا کہ قومی زبان کا مسئلہ قومی اسمبلی میں طے ہونا چاہیے۔ اس مسئلہ کی شدت سے مشرقی پاکستان میں لسانی فسادات شروع ہو گئے۔ طلبہ کے جلوس پر پولیس کی فائرنگ سے کئی طلبہ ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ (۲۳)

امروز نے یکم مارچ 1952 کو اس حساس مسئلہ کے بارے میں صفحہ اول پر چار کالمی خبر تفصیل کے ساتھ شائع کی کہ:

''حکومت پاکستان سے ڈھاکہ میں طلبہ کے جلوس پر فائرنگ کی آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ''

ذیلی سرخی میں لکھا تھا کہ مرکزی حکومت مشرقی بنگال کے عوام پر تشدد کی بجائے عقل اور دلیل سے کام لینے کی ہدایت کرے۔ ان واقعات کی خبریں امروز نے مسلسل شائع کیں۔ ایک خبر تھی کہ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے 9 نکاتی مطالبات کی منظوری کے لیے 36 گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا، نیز 5 مارچ کو یوم شہداء منانے کا اعلان۔ یعنی امروز نے اس مسئلہ کو اپنی خبروں، مضامین اور اداریوں وغیرہ میں بہت اہمیت دی۔ ''خطرناک ارادے'' کے عنوان سے امروز کے ایک اداریے میں لکھا گیا کہ حکومت نے مشرقی پاکستان کے ایک غیر مسلم لیگی اخبار پاکستان آبزرور کو اس لیے بند کر دیا تاکہ تنقید سے بچا جا سکے۔ دفعہ 144 کے تحت طلبہ پر گولی چلادی گئی اور بہت سی گرفتاریاں کی گئیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وزیر اعلیٰ نور الامین کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔'' (۲۴)

مشرقی پاکستان

اوائل 1948 میں مشرقی پاکستان میں زرعی اصلاحات ہوئیں۔ اس سلسلے میں صوبائی وزیر مال چودھری حمید الحق کی طرف سے اسمبلی میں مسودہ قانون پیش ہوا تو امروز نے اسے بہت سراہا اور جاگیرداری کو کاشتکاروں کی جان کا روگ قرار دیتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ جاگیرداری کے خاتمہ کے بعد وہاں کا تباہ حال پسا ہوا کسان سکھ کا سانس لے سکے گا اور اصلاحات سے کم از کم اتنا

فائدہ ضرور ہوگا کہ بنگال کی تباہ حال رعیت کو قدرے سکون مل جائے گا۔

امروز نے نورالامین کی وزارت کو نااہل قرار دیا اور قحط کی وجوہ زمینداری اور جاگیرداروں سے حکومت کی نرمی اور زمینداروں کی طرف سے کی گئی ذخیرہ اندوزی ختم کرانے میں حکومت کی ناکامی قرار دیا۔ امروز نے ایک ایسے کمیشن سے قحط کی تحقیقات کرانے کا مطالبہ بھی کیا جس میں اکثریت غیر سرکاری افراد کی ہو۔

مولوی فضل الحق کے ایک بیان کے حوالے سے امروز نے لکھا کہ انہیں اپنے متعصب بیان کی پرزور تردید کرنے کی ضرورت تھی۔ روزنامہ امروز نے مولوی فضل الحق کی وزارت سے برطرفی کو انتہائی قدم قرار دیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ مسئلہ انتظامی کی بجائے سیاسی تھا۔ یہ ایک منتخب جمہوری حکومت تھی جسے پوری طرح کام کرنے سے پہلے عجلت میں ختم کر دینے کا فیصلہ کیا گیا جو غیر دانشمندانہ تھا۔ کیونکہ اس طرح کے اقدام سے مشرقی پاکستانی عوام میں نفرت کے جذبات اور زیادہ اُبھرنے کا موقع ملے گا اور ان میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ انہیں اپنی مرضی کی حکومت کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان فاصلے بھی بڑھ جائیں گے۔ (۲۵)

سیاسی جماعتیں

1968 کے اواخر میں جب ایوب خان کے خلاف تحریک چلی تو امروز نے بائیں بازو کی جماعتوں پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی اور مظفر احمد) عوامی لیگ اور جمعیت علمائے اسلام (ہزاری گروپ) کی خبریں بہت نمایاں شائع کر کے ان پارٹیوں کی واضح حمایت کی۔ ان کے علاوہ کسان پارٹی کمیٹی، پروگریسو اسٹوڈنٹس فرنٹ، بائیں بازو کی مزدور تنظیموں وغیرہ، تمام طبقاتی ترقی پسند تنظیموں کی خبروں کو بھی اہمیت دی۔ ان کے علاوہ واپڈا، روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے ملازمین اور اساتذہ کے مسائل کی بھرپور حمایت کر کے ان کی ہمدردیاں حاصل کی گئی۔

قادیانیوں کے خلاف تحریک

مارچ 1953 میں ملک میں ختم نبوت تحریک (اینٹی قادیانی تحریک) اس قدر شدت اختیار کرگئی کہ لاہور میں 8 مارچ 1953 کو مارشل لاء نافذ کرنا پڑا جو پاکستان کی تاریخ کا پہلا مارشل لاء تھا۔ روزنامہ امروز نے اس دوران ایک ترقی پسند اخبار کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے دیگر اخبارات کی طرح جذباتیت سے گریز کیا اور دونوں فریقین کی ترجمانی کی۔ اگرچہ ربوہ میں مرزائیوں کے قائدین کی گرفتاری کو صفحہ اول پر شائع کیا گیا لیکن 3 مارچ 1953 کے اداریے میں سیفٹی ایکٹ کے تحت مرزائیوں کے ترجمان اخبار الفضل اور ان کی مخالف تحریک کے ترجمان آزاد پر پابندی کو ناپسند کیا گیا۔ بحث میں لکھا گیا کہ دونوں جرائد قادیانیت اور ظفر اللہ خان کے حق میں یا خلاف لکھتے آئے ہیں، اگر واقعی کوئی قابل اعتراض مواد شائع ہوا تھا تو عدالت میں رجوع کیا جانا چاہیے تھا۔ اداریے میں سیفٹی ایکٹ کی مخالفت کی گئی۔ (۲۶)

امور خارجہ

اوائل 1948 میں قائد اعظم نے ہندوستان کے ساتھ مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کی۔ روزنامہ امروز نے اس تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ ہندوستان کے دفاع کا مسئلہ بھی اس وقت تک خوش اسلوبی سے حل نہیں ہوسکتا جب تک اس کے دفاع میں پاکستان بھی اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ امروز نے اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر اس رائے کا اظہار کیا کہ اس براعظم کی سرحدی چوکیاں خیبر، چٹاگانگ، گلگت اور راس کماری ہی نہیں بلکہ ایک طرف ایران اور قاہرہ تو دوسری طرف سنگاپور اور جاوا بن گئی ہیں۔ اگر ہمیں پاکستان کو بیرونی حملوں سے محفوظ کرنا ہے تو ان کے ساتھ بھی دفاع کے معاملے میں ہمارا کوئی تصفیہ ہونا چاہیے۔ ایٹم کے اس دور میں ایشیاء کے تمام ممالک دفاع کے اعتبار سے ایک واحد بن گئے ہیں۔ (۲۷)

ہمارے اخبارات ابتداء ہی سے روس اور امریکہ کی آویزش اور نظریاتی کشمکش کا شعور رکھتے تھے اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل اپنے اسی شعور و فہم کے مطابق چاہتے تھے۔ اپنی اشاعت کے دو ماہ بعد روزنامہ امروز نے ایک طویل اداریے میں امریکہ اور روس کی آویزش کا

تفصیلی جائزہ لیا اور ان کی کشمکش کے جاری رہنے اور دنیا کو متاثر کرنے کی توقع ظاہر کی۔

امروز نے لکھا کہ امریکہ کے سرمایہ دار دنیا میں سرمایہ داری نظام کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں کیونکہ اگر یہ نظام باقی نہیں رہتا تو سیاسی برتری بھی ختم ہو جائے گی۔ امروز نے لکھا کہ اس مقابلے میں روس کی اشتراکی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ہٹلر اور مسولینی کی شکست کا یہ مطلب نہیں کہ سرمایہ داری کو شکست ہو گئی۔ اس کے نزدیک دنیا کی نئی تعمیر خالص جمہوری اصولوں پر ہونی چاہیے اور سرمایہ داری کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی۔ روس کی اشتراکی حکومت کا یہ پختہ عقیدہ ہے اور اپنے اس عقیدے کی اشاعت کے لیے مجبور ہے اور وہ اس ضمن میں بعض ایسے الفاظ استعمال کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے جنہیں امریکہ والے جمہوریت کش سمجھتے ہیں۔ (۲۸)

مئی 1954 میں پاکستان نے امریکہ سے باقاعدہ فوجی معاہدہ کیا۔ امریکہ سے دفاعی معاہدے پر دستخط ہو جانے کے کام کو امروز نے اہل پاکستان کو اعتماد میں لیے بغیر حکومت کی طرف سے کیا گیا کام قرار دیا۔ اخبار نے لکھا کہ فوجی امداد کا معاہدہ دراصل فوجی معاہدہ ہے اور پاکستان نے اس کے ذریعے نہایت سادہ لوحی سے اپنے آپ کو مغربی بلاک سے وابستہ کر لیا ہے۔ ایک اور اشاعت میں پاک امریکہ فوجی معاہدہ کی مختلف شقوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور اسے پاکستان کے حق میں سراسر بے سود بلکہ نقصان دہ قرار دیا اور لکھا کہ اس کی رو سے پاکستان کو بلاوجہ امریکہ کو اپنے معاملات میں دخل دینے کی اجازت دینا ہو گی۔ (۲۹)

امروز نے معاہدہ سیٹو کی بھی مخالفت کی اور دوسری سیٹو کانفرنس میں پاکستان کی مخالفت کی اور لکھا کہ ہمارا شمار ان ممالک میں ہونے لگا ہے جو سوشلسٹ ممالک کے سرگرم مخالف ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً نصف دنیا کے ساتھ ہمارا دوستانہ اور معمول کے سفارتی تعلقات بحال رکھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ روزنامہ امروز نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی صورتحال کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اسے عالم اسلام کے اتحاد کی کوششوں کی بجائے مغربی ممالک کی بالادستی قائم کرنے کی کوشش قرار دیا۔ اخبار نے لکھا کہ ترکی کو چھوڑ کر سارے مشرق وسطیٰ میں کم و بیش قرون وسطیٰ کا سا طرز حکومت ہے۔ مطلق العنان بادشاہ عوام کی خواہشات سے بے پرواہ بیرونی طاقتوں کے

اشاروں پر حکومت کرتے ہیں۔ان حکومتوں سے معاہدہ کر کے ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ دنیا کے مسلمانوں کا اتحاد قائم ہو گیا ہے۔(۳۰)

نچلے طبقے کی ترجمانی

روزنامہ امروز میں نچلے طبقے کی ترجمانی میں پیشہ ورانہ تنظیموں کی خبروں کو باقاعدہ اہمیت دی گئی۔اداراتی امور میں ان کی حمایت کی گئی۔جولائی 1948 میں اخبار کے صفحہ اول پر دو کالمی جگہ پر ''کیا حل ہے اس ناداری کا؟'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی جس میں مرد مسلمان سے سوال کیا گیا تھا کہ ناداری کے خلاف مزدور کے حامی کافر ہیں؟ اسی ماہ کے اخبار میں صفحہ اوّل پر ایک باکس خبر کی سرخی تھی ''اللہ میاں سے درخواست''۔خبر کے متن میں لکھا تھا کہ لاہور چیف کورٹ کے سامنے چپڑاسیوں نے تنخواہوں میں اضافے کے لیے چلچلاتی دھوپ میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے احتجاجاً یہ دعا کی ہے کہ وہ آقاؤں کو غریبوں کے ساتھ انصاف کرنے کے قابل بنائے۔

کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے ورکروں کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے حوالے سے اخبار میں خاص طور پر ایسی خبریں شائع ہوئیں جن سے مزدوروں کے اجتماعی مفاد کو اُجاگر کیا گیا۔اس سلسلے میں حکومت کے معمول کے اقدامات کو بھی مزدوروں کے حق میں شائع کیا گیا۔مثلاً ایک اشاعت کے صفحہ چار پر دو کالمی خبر کی سرخی تھی ''مزدوروں کے متعلق تین قانون بنائے جائیں گے''۔خبر میں باوثوق ذرائع سے بتایا گیا تھا کہ مزدوروں کی بہتری کے لیے انشورنس اسکیم، تنخواہوں کی حالت اور ٹریڈ یونین ایکٹ میں ترمیم کی جائے گی۔''(۳۱)

''بڑی زمینداروں کی تنسیخ'' کے عنوان سے اداریے میں لکھا گیا کہ زمینداروں کے خاتمے کے سلسلے میں مشرقی پاکستان میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں یوپی اور بہار اسمبلی بھی اس سلسلے میں غور کر رہی ہے۔لیکن مغربی پاکستان والے خاموش ہیں۔ چنانچہ ایسی تمام زمینیں بلا معاوضہ کاشتکاروں میں تقسیم ہونی چاہئیں۔مارچ 1952 میں صفحہ اول پر ایک چار کالمی خبر شائع ہوئی۔''زرعی نظام انگریزی دور کی یادگار ہے۔حکومت نے ترقی کا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔پنجاب کے دیہات میں لوگ آج بھی بھوک اور افلاس کا شکار ہیں''۔ یہ خبر زراعت کے مطالبہ زر میں

تخفیف کی تحریک سے متعلق تھی۔ ''آزاد پاکستان پارٹی'' کی جانب سے متعدد جلسوں کے حوالے سے مزارعین اور کسانوں کی حمایت میں ایک دو کالمی خبریں شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً موضع دھیر میں پارٹی کے جلسے کے حوالے سے صفحہ پانچ پر دو کالمی خبر کی سرخی تھی ''جاگیرداروں اور زمینداروں نے زرعی اصلاحات کو زرعی فسادات بنا رکھا ہے''۔ مزارعین کو مسلسل بے دخل کیا جا رہا ہے۔ پارٹی کے جنرل سیکریٹری شیخ محمد رشید کے شیخوپورہ کے جلسے کے حوالے سے ایک کالمی خبر میں جاگیرداری کے خلاف متحدہ ہونے کی اپیل تھی۔ اسی طرح کسانوں کے جلسے سے خطاب میں میاں محمود علی قصوری، کامریڈ ابراہیم، شیر محمد، علی بخش اور غلام فرید کے مطالبات کو بھی اخبار میں جگہ دی گئی۔ زرعی اصلاحات سے مسلم لیگ پارٹی میں پیدا ہونے والے انتشار کو اخبار میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ اپریل 1952 میں صفحہ اول پر چار کالمی خبر شائع ہوئی کہ ''زرعی اصلاحات کے خلاف پنجاب کے بڑے زمیندار انجمن زرعی اصلاحات شرعی قائم کریں گے''۔ جماعت میں پائے جانے والے اختلافات کو یوں نمایاں کیا گیا کہ ''صوبائی مسلم لیگ کے صدر نے اس کشمکش میں نئی جماعت میں شرکت کرنے والوں کے خلاف احکامات دے دیئے ہیں''۔ ایک دو کالمی خبر کو اس سرخی کے ساتھ صفحہ آخر پر شائع کیا گیا۔ ''زرعی زمینوں کو قومی ملکیت قرار دے کر کاشتکاروں کو موروثی حقوق مزارعیت دیئے جائیں''۔ اس خبر میں مسلم لیگ کے کنونشن کے لیے عبدالوحید خان کی قرارداد کو تفصیل کے ساتھ شائع کیا گیا کہ دولت کو چند مخصوص طبقات تک محدود ہونے سے روکا جائے اور صنعتی پیداوار کا کم از کم 75 فیصد مزدوروں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے۔ نیز ٹیکس لگائے جائیں اور فالتو زمینیں بلا معاوضہ اسٹیٹ کی ملکیت میں لے لی جائیں۔ (۳۲)

1978 میں ملتان کے صنعتی علاقے میں قائم کالونی ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے اُجرتوں میں اضافہ اور حالات کار کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کی۔ پولیس اور ملز کے گارڈز نے ملز کے اندر مزدوروں پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں بہت سے مزدور ہلاک اور زخمی ہوئے۔ امروز نے ملتان کے اس واقعے کو تفصیل سے کور کیا۔ خبروں کے ساتھ پولیس فائرنگ میں ہلاک ہونے والے مزدوروں کی لاشوں کی تصاویر بھی شائع کی گئیں۔ دیگر اخبارات نے اس واقعہ کو اہمیت نہیں دی۔ کالونی ٹیکسٹائل ملز کے مالک اس وقت کے صدر جنرل ضیاء الحق کے قریبی

دوستوں میں شامل تھے۔ وزارت اطلاعات کے دباؤ پر امروز ملتان کے ایڈیٹر مسعود اشعر کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا جس پر امروز کے صحافیوں نے احتجاجی تحریک چلائی جس پر ان کا تبادلہ منسوخ ہوا۔ مخالف سیاسی جماعتوں کے اتحاد تحریک بحالی جمہوریت نے 14 اگست 1983 سے 1973 کے آئین کی بحالی اور عام انتخابات کے انعقاد کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اس تحریک کا سب سے زیادہ اثر سندھ میں ہوا۔ نیشنل ہائی وے سے منسلک مختلف شہروں کے احتجاجی مظاہرین نے ہائی وے پر دھرنے دیئے۔ فوج نے ان مظاہرین پر متعدد بار فائرنگ کی جس سے بہت سے افراد ہلاک ہوئے۔ یوں محسوس ہوا کہ فوج سندھیوں کی نسل کشی کر رہی ہے۔ پنجاب کے صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں نے سندھ کے عوام کے ساتھ یکجہتی کے لیے ایک دستاویز پر دستخط کیے۔ یہ دستاویز کچھ ملکی اخبارات میں شائع ہوئی اور غیر ملکی میڈیا نے اس دستاویز کو خاصی اہمیت دی۔ جنرل ضیاء الحق کی ہدایت پر روزنامہ امروز اور روزنامہ مشرق کے ان 10 صحافیوں کو برطرف کیا گیا جنہوں نے اس دستاویز پر دستخط کیے تھے۔ ان صحافیوں میں روزنامہ امروز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مسعود اشعر، شفقت تنویر مرزا، فیچر رائیٹر مسز رخشندہ حسن، رپورٹر بدرالاسلام، روزنامہ مشرق کے اسسٹنٹ ایڈیٹر عزیز مظہر، رپورٹر ممتاز احمد، اورنگزیب، پاکستان ٹائمز کے چیف رپورٹر آئی اے رحمان راشد اور اسسٹنٹ ایڈیٹر ریاض ملک شامل تھے۔ ان صحافیوں کو اپنے ضمیر کے مطابق اظہارِ رائے پر یہ سزا دی گئی۔ 1988 میں پیپلز پارٹی کی حکومت بے نظیر بھٹو کی قیادت میں قائم ہوئی۔ اس حکومت نے ان صحافیوں کو بحال کیا۔ امروز نے جمہوریت کے احیاء، انسانی حقوق کی بحالی اور مظلوم طبقات کے لیے ہمیشہ آواز اٹھائی۔

حوالہ جات

۱۔ اشرف راشد، چراغ حسن حسرت، ہم تم کو نہیں بھولے، بزم تخلیق، کراچی، صفحہ 44,45

۲۔ Usmani Irfan Waheed, Print Culture and Left Wing Radicalism in Lahore, Pakistan, 1947-1971

۳۔ اشعر مسعود، سابق ایڈیٹر روزنامہ امروز، لاہور، ذاتی انٹرویو، 15 جون 2017

۴۔ ایضاً

۵۔ ناز، ڈاکٹر احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ 121

۶۔ سبحانی، ڈاکٹر میمونہ، ہم سفیرانِ فیض، شمع بکس، فیصل آباد، صفحہ 71

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

۹۔ Usmani Irfan Waheed, Print Culture and Left Wing Radicalism in Lahore, Pakistan, 1947-1971

۱۰۔ Usmani Irfan Waheed, Print Culture and Left Wing Radicalism in Lahore, Pakistan, 1947-1971

۱۱۔ نیازی، ضمیر، صحافت پابند سلاسل، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، صفحہ 120,121,122

۱۲۔ خان (ڈاکٹر)، توصیف، آزادیٔ صحافت کی جدوجہد میں اخباری تنظیموں کا کردار، کراچی پریس کلب، صفحہ 229

۱۳۔ ناز، ڈاکٹر احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ 121

۱۴۔ ناز، ڈاکٹر احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ 122

۱۵۔ ایضاً، صفحہ 127

۱۶۔ ایضاً،صفحہ 128

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً،صفحہ 129

۱۹۔ ایضاً،صفحہ 130

۲۰۔ ایضاً،صفحہ 131

۲۱۔ ایضاً،صفحہ 132

۲۲۔ ایضاً،صفحہ 134

۲۳۔ ایضاً،صفحہ 44

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً،صفحہ 41

۲۷۔ ایضاً،صفحہ 49

۲۸۔ ایضاً،صفحہ 50

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً

ڈیلی پاکستان ٹائمز

صوبہ پنجاب میں انگریزی اخبارات کی تاریخ خاصی قدیم تھی مگر بیشتر انگریزی اخبارات یا تو انگریز حکومت کے حامی تھے یا پھر کانگریس کی حمایت کرتے تھے،اور مسلم لیگ کے حامی انگریزی اخبار کی اشد ضرورت تھی۔معروف صحافی اور دانشور عبداللہ ملک کا کہنا ہے کہ مئی 1946 تک پنجاب میں کوئی ایسا اخبار نہیں تھا جس کو مسلم لیگ کا حقیقی ترجمان قرار دیا جا سکے۔ایک دو اُردو کے اخبارات دعویٰ کرتے تھے کہ وہ مسلم لیگ کے حامی ہیں مگر یہ اخبارات مسلم لیگ کے نظریات کی عملی طور پر ترویج کرنے میں ناکام تھے۔یہ اخبارات اقتدار کے ایوانوں میں مسلم لیگ کا مقدمہ پیش کرنے میں ناکام رہے تھے۔(۱)

ان حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی جناح کی تجویز پر پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (PPL) کے قیام کا فیصلہ ہوا۔محمد علی جناح مسلم لیگ کی سینٹرل کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور آئے تو انہوں نے خاص طور پر پاکستان ٹائمز کے شائع کرنے کا خیال عام کیا اور میاں افتخار الدین سے ملاقات کی۔مئی 1946 میں پاکستان پروگریسو پیپرز لمیٹڈ قائم ہوا اور فروری 1947 میں لاہور سے پاکستان ٹائمز کا اجراء ہوا۔ پھر ایک سال بعد اردو کا اخبار امروز شائع ہونا شروع ہوا۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے بانی اراکین میں سے چار کا تعلق پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی سے تھا، باقی دو صنعت کار اور ایک زمیندار تھے۔ڈاکٹر میمونہ سبحانی نے کتاب ہم صفیران فیض میں عبداللہ ملک کے حوالے سے لکھا ہے کہ بانی اراکین کے نام یہ تھے:

۱۔	نواب افتخار الدین ممدوٹ،	صدر پنجاب مسلم لیگ
۲۔	میاں ممتاز دولتانہ،	جنرل سیکریٹری پنجاب مسلم لیگ، ممبر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی
۳۔	سردار شوکت حیات،	ممبر لیجسلیٹو اسمبلی پنجاب

۴۔ محمد رفیع بٹ، بینکر
۵۔ ایس اے لطیف، صنعت کار، انجینئرنگ کمپنی
۶۔ سید امیر حسین شاہ، زمیندار گجرات
۷۔ میاں افتخار الدین، ممبر لیجسلیٹو اسمبلی، پنجاب

اکتوبر 1946 میں میاں افتخار الدین کو اتفاق رائے سے کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر کیا گیا کیونکہ ان کے پاس کمپنی کے سب سے زیادہ حصص تھے۔(۲)

فیض احمد فیض اور مولانا چراغ حسن حسرت جرمنی نازی اور جاپان کی حکومتوں کے خلاف پروپیگنڈا کے لیے مواد مرتب کرنے والی ٹیم کا حصہ تھے۔ فیض احمد فیض پاکستان بننے کے بعد فوج سے مستعفی ہوئے اور انہیں پاکستان ٹائمز کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ پی پی ایل کے اخبارات کی اشاعت بہت زیادہ نہیں تھی اس کی وجوہات میں کم شرح خواندگی اور دوسری اہم وجہ پنجاب کی تقسیم تھی۔ پنجاب کی تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں افراد ہجرت پر مجبور ہوئے تھے۔ پھر عام آدمی کی آمدنی اتنی کم تھی کہ اس کے لیے اخبار خریدنا عیاشی کے مترادف تھا مگر چند ہی برسوں میں پی پی ایل کے اخبارات کی اشاعت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ صرف پہلے 10 برسوں میں پاکستان ٹائمز کی اشاعت 8 ہزار سے بڑھ کر 34 ہزار تک پہنچ گئی۔ اُردو کے اخبار روزنامہ امروز کی اشاعت 50 کی دھائی میں 6 ہزار تھی جو 1958 تک 40 ہزار تک پہنچ گئی۔(۳)

روزنامہ امروز کے ملتان، کراچی اور پشاور کے ایڈیشن شائع ہونے لگے۔ روزنامہ امروز نے تیزی سے اپنی اشاعت میں اضافہ کیا اور یہ جنوبی پنجاب کا سب سے مقبول اخبار بن گیا۔ اس کے قارئین کی تعداد اپر سندھ میں بڑھ گئی۔ روزنامہ امروز سکھر اور لاڑکانہ کا مشہور اخبار کہلانے لگا۔ پی پی ایل کی انتظامیہ نے 1957 میں ایک ہفت روزہ رسالہ لیل ونہار شائع کیا جس کا ایڈیٹر معروف دانشور سبط حسن کو مقرر کیا گیا۔ یہ اُردو کا اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا جس کو بین الاقوامی معیار کے نیوز میگزین کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ پی پی ایل نے 1959 میں ماہانہ اسپورٹس ٹائمز شائع کرنا شروع کیا۔ یہ رسالہ 1984 تک شائع ہوتا رہا۔(۴)

میاں افتخار الدین نے ایک کمپنی پاک روز قائم کی تھی۔ پاک روز چین سے کوئلہ درآمد

کرتی تھی۔ میاں صاحب نے اپنے کاروبار سے حاصل ہونے والی آمدنی کو پی پی ایل کے لیے وقف کردیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پی پی ایل کے صحافیوں اور کارکنوں کو وقت پر تنخواہیں ملتی تھیں اور دیگر اخباری اداروں کے مقابلے میں مراعات بھی زیادہ تھیں۔ میاں افتخار الدین کی ایک فرم سوویت یونین سے اخباری کاغذ درآمد کرتی تھی جو کہ رعایتی قیمتوں پر پی پی ایل کے اخبارات کے لیے دستیاب ہوتا تھا۔ میاں افتخار الدین نے پی پی ایل میں ایڈیٹر کے ادارہ کو مکمل طور پر بااختیار کیا تھا اور ادارتی امور اخبارات کے ایڈیٹر کی صوابدید پر طے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پی پی ایل کے اخبارات پیشہ وارانہ معیار کی بلندیوں پر تھے۔ میاں افتخار الدین نے اپنے اخبارات کے لیے قابل اور محنتی صحافیوں کا انتخاب کیا تھا۔ معروف صحافی پاکستان ٹائمز کے سابق چیف ایڈیٹر آئی اے رحمٰن اور روزنامہ امروز کے ایڈیٹر مسعود اشعر کا کہنا ہے کہ میاں افتخار الدین پروفیشنل صحافیوں کا تقرر کرتے تھے۔ وہ کمیونسٹ صحافیوں کے تقرر کے حق میں نہیں تھے کیونکہ وہ ان اخبارات کو کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ پی پی ایل کے اخبارات میں ان لوگوں کے کالم اور آرٹیکل شائع ہوئے جو میاں افتخار الدین کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔ پاکستان ٹائمز میں خبر کی معروضیت، اس کی ادارت اور اخبار کے لے آؤٹ پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چند ہی برسوں میں پاکستان ٹائمز کا شمار اس خطے کے بہترین ادارت شدہ اخبارات میں ہونے لگا۔(۵)

یہی صورتحال اردو میں شائع ہونے والے اخبار امروز کی تھی۔ امروز کے ایڈیٹر اور صحافیوں نے اخبار کے میک اپ کو آسان اور سہل کردیا تھا۔ ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے روزنامہ امروز کو کانگریس کے اخبار قومی آواز سے تشبیہ دی تھی۔ روزنامہ امروز اردو کا پہلا اخبار تھا جو روٹری مشین پر شائع ہوا۔ اس وقت کی اس جدید مشینری کے استعمال سے اخبار بڑی شیٹ پر چھپنے لگا۔ تصاویر واضح اور صاف ستھری شائع ہونے لگیں اور لے آؤٹ زیادہ بہتر ہوگیا۔ امروز کے روٹری مشین پر شائع ہونے سے اردو کے دیگر اخبارات کے لیے نئے راستے دریافت ہوگئے، یوں پاکستانی صحافت میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔"(۶)

میاں افتخار الدین پاکستان ٹائمز اور روزنامہ امروز کے ادارتی معاملات میں مداخلت

نہیں کرتے تھے۔ جب 1949 میں برصغیر کے قدیم اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں کشمیر کے تنازعہ کے بارے میں ایک خبر شائع ہوئی تو اخبار کے نئی دہلی کے نمائندے نے اس خبر میں لکھا تھا کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اس بات پر متفق ہوگئی ہیں کہ کشمیر کے جس حصے پر جس کا قبضہ ہے اس کو برقرار رکھا جائے۔ حکومت پاکستان نے اس خبر کی تردید کی۔ سول وملٹری گزٹ نے یہ خبر اخبار کے صفحہ اول پر شائع کی مگر حکومت کی ایماء پر ایڈیٹروں کی تنظیم آل پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس نے ایک مشترکہ اداریہ تیار کیا جس میں کہا گیا تھا کہ سول وملٹری گزٹ کے خلاف اس خبر کی اشاعت پر اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین اور روزنامہ نوائے وقت کے ایڈیٹر حمید نظامی اس اداریے کو تحریر کرنے والوں میں شامل تھے۔ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر فیض احمد فیض نے یہ اداریہ پاکستان ٹائمز میں شائع کیا۔ روزنامہ امروز کے ایڈیٹر چراغ حسن حسرت نے پہلے دن اس اداریے کو شائع کرنے سے انکار کیا، دوسرے دن یہ اداریہ امروز میں شائع ہوا تو میاں افتخار الدین نے یہ تبصرہ کیا کہ ایسا ہی اداریہ آپ کے خلاف بھی استعمال ہوگا۔ اس اداریہ کے خلاف روزنامہ پاکستان ٹائمز میں پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے رہنما مرتضٰی شفیع نے احتجاج کیا جنہیں معطل کیا گیا۔ بعد میں مرتضٰی شفیع بحال ہوئے مگر ایڈیٹر کی اتھارٹی برقرار رہی۔ بعد میں فیض صاحب نے اس اداریہ کی اشاعت پر اپنی غلطی تسلیم کی۔ (۷)

پاکستان ٹائمز سے اپنے صحافتی مستقبل کا آغاز کرنے والے سینئر صحافی آئی اے رحمٰن کا کہنا ہے کہ میاں افتخار الدین اپنی جماعت کی خبروں کی اشاعت کے لیے کسی قسم کا دباؤ استعمال نہیں کرتے تھے۔ رحمٰن صاحب کا کہنا ہے کہ وہ ایک جونیئر سب ایڈیٹر تھے۔ کسی فرد نے سفارش کی کہ ایک خبر شائع کر دی جائے، میں نے واضح کیا کہ میاں صاحب سے کہو کہ وہ خود شائع کر دیں۔ اگر خبر میں دم ہوگا تو خود شائع ہو جائے گی۔ (۸)

معروف صحافی خالد حسین اپنی یادداشتوں کے حوالے سے ملک کے معروف فوٹوگرافر ایف آئی چوہدری جو پاکستان ٹائمز میں ملازم تھے کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ چوہدری جو چچا کے نام سے جانے جاتے تھے کبھی غصے میں نہیں آتے تھے مگر میاں افتخار الدین کی کسی بات پر انہیں شدید غصہ آ گیا۔ چچا نے بلند آواز میں کہا، میاں جی میں نے تیری نوکری نہیں کرنی اور پھر دفتر سے

چلے گئے۔ دوسرے دن پی پی ایل کے مالک میاں افتخار الدین نے ایف سی چوہدری کے گھر جا کر معافی مانگی اور درخواست کی کہ وہ کام پر واپس آ جائیں۔ شعبہ ابلاغ عامہ کی طالبہ نائلہ رضا پی پی ایل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ پی پی ایل کے قیام سے پہلے صحافیوں کے لیے صحافت فل ٹائم پیشہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک طرح کا مشن سمجھا جاتا تھا۔ صرف صحافی ہی نہیں بلکہ اخباری مالکان بھی مالیاتی بحران کا شکار رہتے تھے۔ اس زمانے میں صحافیوں پر کوئی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ صحافیوں کو نہ تو کوئی قرضہ دیتا تھا نہ کوئی لڑکی دینے کو تیار ہوتا تھا مگر پی پی ایل نے صحافیوں کو باقاعدہ فل ٹائم پروفیشن کا درجہ دیا، یوں صحافیوں کو قرضے ملنے لگے اور ان کی شادیاں ہونے لگیں۔(۹)

دائیں بازو کے صحافی شورش کاشمیری جنہوں نے میاں افتخار الدین کی تنقید سے بھرپور سوانح عمری لکھی ہے۔ وہ پی پی ایل کو عظیم ادارہ اور میاں افتخار الدین کی کامیابی قرار دیتے ہیں۔ شورش لکھتے ہیں کہ میاں صاحب ایک بڑا کارخانہ قائم کر سکتے تھے۔ وہ ایک اچھے تاجر کی خوبیاں رکھتے تھے۔ انہوں نے ہماری سرمایہ دارانہ اور صنعتی طبقے کے ارتقاء کو دیکھا۔ یہ طبقہ اب Monster بن گیا ہے مگر انہوں نے اپنے سیاسی تصور کو اہمیت دی اور ملک کی دانش ورانہ تربیت کے لیے دو عظیم اخبارات شائع کیے۔ میاں افتخار الدین نے ملک کے بہترین صحافیوں کا انتخاب کیا۔ 1947 سے 1960 تک فیض احمد فیض، مظہر علی خان اور احمد علی خان جیسے پروفیشنل صحافی پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر رہے۔ پھر کمال حیدر، جمیل احمد، خواجہ آصف، زبیر صدیقی اور ایم اے شکور جیسے صحافی پاکستان ٹائمز کے نیوز روم سے منسلک رہے۔ پھر میاں محمد شفیع اپریل 1950 تک پاکستان ٹائمز کے چیف رپورٹر رہے۔ ان کے مستعفی ہونے کے بعد راولپنڈی میں پاکستان ٹائمز کے نمائندے افتخار علی چیف رپورٹر کے عہدے پر تعینات ہوئے۔ فیض احمد فیض فروری 1947 سے مارچ 1951 تک ایڈیٹر رہے۔ پھر فیض صاحب کو راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ چار برسوں تک مختلف جیلوں میں قید رہے اور اپنی قید کا پہلا حصہ قید تنہائی میں گزارا۔ پھر 5 فروری 1956 کو فیض احمد فیض رہا ہو کر آئے تو انہیں چیف ایڈیٹر مقرر کیا۔ وہ 2 جون 1958 تک اس عہدے پر تعینات رہے۔ فیض صاحب نے مختصر عرصہ پاکستان ٹائمز میں گزارا مگر پی پی ایل کے اخبارات کی پالیسی اور اسٹائل میں فیض صاحب کی سوچ و فکر کا اہم کردار رہا۔ فیض صاحب

نے پہلے پاکستان ٹائمز میں جمہوری روایات ڈالیں۔انہوں نے ادارتی عملے سے روزانہ اجلاسوں کا سلسلہ شروع کیا۔ان اجلاسوں میں صحافی کھل کر مختلف امور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ پھر امروز میں بھی یہ سلسلہ شروع کیا۔ پاکستان کی صحافت میں صحافتی عملے کے اجلاسوں اور اخبارات پیش کرنے کی آزادی کا یہ پہلا تجربہ تھا۔اخبارات میں مالکان ایڈیٹر کی اس قسم کی آزادی کا تصور نہیں کرتے تھے مگر اب یہ سلسلہ عام ہوا۔

میاں افتخار الدین کا مزاج مختلف اوقات میں مختلف نوعیت کا ہوتا تھا۔بعض اوقات وہ ایک تاجر کی طرح بات کرتے مگر وہ ایڈیٹروں اور صحافیوں کے خیالات کو سنتے اور برداشت کرتے تھے۔ممتاز ادیب انتظار حسین جنہوں نے روزنامہ امروز میں ملازمت اختیار کی ایسے ہی اجلاس کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض اوقات صحافیوں اور انتظامیہ میں تضادات شدت اختیار کرتے تھے تو فیض صاحب مداخلت کرتے۔فیض احمد فیض ایڈیٹر کی خودمختاری پر یقین رکھتے تھے۔فیض صاحب نے عوام کی بالادستی کے تصور کے تحت پاکستان ٹائمز کی ادارتی پالیسی بنا رکھی تھی۔اس پالیسی کا بنیادی مقصد مظلوم طبقات، مزدوروں، کسانوں اور خواتین کے بنیادی حقوق کے لیے آواز بلند کرنا تھا۔فیض احمد فیض نے 1959 میں ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ملک کی سیاست میں اصلاحات اور عوام کے سیاسی شعور کی بلندی یہ اخبار کے دو بنیادی اہداف ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ جو اخبار یہ فریضہ انجام نہیں دے گا وہ اخبار کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔روزنامہ پاکستان ٹائمز کے دوسرے ایڈیٹر مظہر علی خان کا تعلق اٹک کے جاگیردارانہ خاندان سے تھا مگر وہ ایک کمیونسٹ تھے۔مظہر علی خان نے 1947 میں پاکستان ٹائمز میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ جب فیض احمد فیض کو راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیا گیا تو مظہر علی خان ایڈیٹر ہوئے۔مظہر علی خان اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے کہ جمہوری معاشرے میں رائے عامہ کی تشکیل میں اخبارات کا بنیادی کردار ہے۔ان کا کہنا تھا کہ ایک جمہوری ریاست میں نظریات کے ٹکراؤ سے رائے عامہ تشکیل پائے گی۔انہوں نے ساری زندگی اپنے آدرش کی پاسداری کی۔ احمد علی خان کو پاکستان کی انگریزی صحافت کے اولین معماروں میں شامل کیا جاتا ہے۔خان صاحب نے 1949 میں پاکستان ٹائمز میں شمولیت اختیار کی اور وہ 13 سال تک پاکستان ٹائمز

سے منسلک رہے۔ احمد علی خان ایڈیٹر کے Motivational Role کے قائل تھے اور ایڈیٹر کی خودمختاری پر یقین رکھتے تھے۔ خان صاحب ایڈیٹر کو صحافیوں کے مفادات کے تحفظ کا امین سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ خبر کی معروضیت پر یقین رکھتے تھے۔ ریاستی اداروں اور پریشر گروپوں کے خلاف مزاحمت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ جب فروری 1959 کو جنرل ایوب خان کی حکومت نے پی پی ایل کے اخبارات پر قبضہ کیا تو پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خان مستعفی ہو گئے تو احمد علی خان روزنامہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں وہ پاکستان ٹائمز سے مستعفی ہوئے اور روزنامہ ڈان میں ملازمت کر لی۔ (۱۰)

پاکستان ٹائمز جب فروری 1947 میں لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا تو لاہور کی تین برادریوں ہندو، سکھ اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات انتہائی کشیدہ تھے۔ پھر پاکستان ٹائمز مسلم لیگ کا ترجمان اخبار تھا۔ اس سال پاکستان ٹائمز کے شماروں میں شائع ہونے والی خبروں، آرٹیکل، اداریوں اور کارٹون میں اس کی عکاسی ہوتی تھی مگر مجموعی طور پر پاکستان ٹائمز نے ذمہ دارانہ صحافت کی۔ پاکستان ٹائمز نے خضر حیات ٹوانہ کے خلاف چلنے والی تحریک کی بھرپور حمایت کی مگر فرقہ وارانہ مواد شائع کرنے اور ہندو مسلمان فسادات کی ہولناک داستانوں کو شائع کرنے سے پرہیز کیا۔ عرفان عثمانی کارٹونسٹ انور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انور علی کا تعلق لدھیانہ سے تھا۔ انہوں نے اگست 1947 میں پاکستان ٹائمز میں شمولیت اختیار کی۔ پھر اپنے بیٹے کی بیماری کی خبر پر لدھیانہ گئے۔ انور علی نے وہاں مسلمان کش فسادت کو دیکھا اور اس کا آنکھوں دیکھا حال پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا مگر ان کی تحریر کردہ پہلی قسط کو شائع کیا گیا اور دوسری قسط شائع نہ ہوئی۔ (۱۱)

پاکستان ٹائمز نے پہلے دن سے سامراج دشمن پالیسی اختیار کی۔ برطانوی اور دیگر یورپی ممالک کی نوآبادیات میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی بھرپور کوریج کی۔ اس زمانے میں ہالینڈ کی حکومت نے انڈونیشیا میں احمد سوکارنو کی قیادت میں چلنے والی مزاحمتی تحریک کو کچلنے کے لیے بدترین تشدد کیا۔ پاکستان ٹائمز نے خبروں، آرٹیکل اور اداریوں میں انڈونیشیا کے عوام کی جدوجہد کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔ (۱۲)

پاکستان ٹائمز نے مظلوم طبقات خاص طور پر ہجرت کر کے آنے والے غریبوں کے

مسائل کو اُجاگر کیا۔ پاکستان بننے کے بعد سرکاری ملازمین نے تنخواہوں میں اضافے کے لیے جدوجہد کی جس کے نتیجے میں حکومت پاکستان نے پے کمیشن قائم کیا۔ اس کے ایوارڈ کے اجراء تک پاکستان ٹائمنر میں اس موضوع پر خبریں شائع ہوئیں۔ پاکستان ٹائمنر کی ایک اور خصوصیت خواتین اور اقلیتوں کے حقوق کو اُجاگر کرنا تھا۔ جس وقت ملک آزاد ہوا سماجی ماحول رجعت پسندانہ تھا۔ محمد علی جناح اور لیاقت علی خان عورتوں کی آزادی پر یقین رکھتے تھے۔ جناح کی بیوی رتی اور پھر ہمشیرہ فاطمہ ان کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں برابر کی شریک تھیں۔ اسی طرح پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کی دوسری اہلیہ رعنا لیاقت علی خان خواتین کے حقوق کے لیے بہت متحرک تھیں مگر مجموعی طور پر خواتین کے حقوق اور ان کی عملی زندگی میں شرکت کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ پاکستان ٹائمنر میں "Pardain Islam" کے نام سے ایک مراسلہ شائع ہوا اور کئی مراسلے شائع ہوئے جن میں برقع پہننے والی خواتین کی مشکلات بیان کی گئیں۔ (۱۳)

پھر فیض احمد فیض کی گرفتاری کے بعد ایلس فیض پاکستان ٹائمنر کے خواتین کے صفحے کی انچارج بن گئیں۔ پاکستان ٹائمنر نے اقلیتوں کے مساوی حقوق کے لیے بھی بھرپور آواز اٹھائی۔ اخبار نے بار بار مطالبہ کیا کہ جداگانہ انتخابات کا طریقہ کار ختم کیا جائے اور مخلوط انتخابات کا طریقہ کار رائج کیا جائے تاکہ اقلیتوں کو مساوی سلوک اور تحفظ کا احساس ہو سکے۔ اخبار نے اپنے اداریوں میں تحریر کیا کہ پاکستان مذہبی ریاست نہیں بن سکتا نہ اقلیتوں سے جذیہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ اخبار نے بھرپور کوشش کی کہ نئی ریاست کا سیکولر امیج اُبھارا جائے۔ اخبار نے محمد علی جناح کے قریبی ساتھی نواب غضنفر علی خان کے آرٹیکل شائع کیے۔ نواب غضنفر علی خان نے اپنے آرٹیکلز میں قائداعظم کے اقلیتوں سے متعلق خیالات کو واضح کیا اور اس بات کی وضاحت کی کہ محمد علی جناح کا مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن بنانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ اجنبیوں جیسا سلوک روا رکھا جائے۔ پاکستان ٹائمنر نے عوام کو جاگیرداروں کے خلاف متحرک کرنے کی کوشش کی۔ اخبار نے لکھا کہ ملک میں یا تو جاگیرداروں کا تحفظ ہوسکتا ہے یا عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق کا۔ دونوں طبقوں کے حقوق کا تحفظ ممکن نہیں ہے۔ پاکستان ٹائمنر نے پاکستان کے یورپ اور امریکہ کے اتحادی بننے کی شدید مخالفت کی۔ پاکستان ٹائمنر نے چین میں چیئرمین ماؤ کے

انقلاب کی خبروں کو بھرپور طریقے سے شائع کیا اور حکمرانوں کو متنبہ کیا کہ یورپ اور امریکہ کا اتحادی بننے کے دوررس نقصانات ہونگے۔ گذشتہ 70 سال کی تاریخ نے اخبار کے خدشات کو درست ثابت کردیا۔ اخبار نے امریکہ سے ملنے والی فوجی اور اقتصادی امداد کا تنقیدی جائزہ لیا اور بتایا کہ ایک مصنوعی معیشت کبھی پائیدار نہیں ہوگی۔ پاکستان ٹائمز نے جمہوری عمل کی بھرپور حمایت کی۔ اخبار نے بار بار تحریر کیا کہ عام آدمی کو بااختیار کیا جائے۔ اسی طرح اخبار نے بنگالی کو قومی زبان کا درجہ دینے، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے عوام کے خدشات کو بھرپور طور پر واضح کیا اور پورے ملک میں حکومت مخالف سیاسی کارکنوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کے خلاف اداریے تحریر کیے۔

پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل ونہار کی پالیسی ایوب خان کے اقتدار کو طول دینے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ پھر امریکی حکومت کو سرد جنگ میں سوویت یونین کے خلاف پاکستان کی ضرورت تھی۔ پاکستان میں آزادیٔ صحافت اور پی پی ایل کے اخبارات میں آزادانہ پالیسی امریکی عزائم میں بڑی رکاوٹ تھی۔ ایوب حکومت نے فروری 1959 میں پی پی ایل پر قبضے کا فیصلہ کیا۔ مسلح فوج نے پی پی ایل کی عمارت پر قبضہ کرلیا۔ ایوب خان کے وزیر ذوالفقار علی بھٹو پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خان کی قیام گاہ پر گئے اور انہیں ایوب خان کا پیغام دیا کہ وہ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہیں مگر مظہر علی خان تیار نہیں ہوئے۔ دوسرے دن صبح مظہر علی خان نے پاکستان ٹائمز کی ایڈیٹر شپ سے استعفیٰ دیدیا۔ فوری طور پر پاکستان ٹائمز میں اس دن کوئی صحافی اداریہ لکھنے پر تیار نہیں تھا، یوں اس وقت کے سیکریٹری اطلاعات قدرت اللہ شہاب نے "New Leaf" کے عنوان سے اداریہ تحریر کیا۔ امروز کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی نے بھی استعفیٰ دیدیا۔ نئی انتظامیہ نے ہفت روزہ لیل ونہار کے ایڈیٹر سبط حسن کو برطرف کردیا۔ (۱۴)

سینئر صحافی آئی اے رحمٰن کا کہنا ہے کہ پی پی ایل پر سرکاری قبضے کا فیصلہ South East Asia Treaty Organization (SETO) کی فلپائن کے دارالحکومت منیلا میں 11 سے 13 مارچ کو ہونے والی کانفرنس میں کیا گیا تھا۔ یہ کانفرنس علاقائی سلامتی کے موضوع پر منعقد ہوئی تھی اور کانفرنس میں پاکستان کی سیاسی صورتحال پر غور کیا گیا تھا۔ کانفرنس میں

مشرقی پاکستان میں بائیں بازو کے بڑھتے ہوئے اثرات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ خاص طور پر نومبر 1959 میں ہونے والے انتخابات کے نتائج پر غور کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے شرکاء نے مشرقی پاکستان میں بائیں بازو کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے اقدامات کے علاوہ مغربی پاکستان میں بائیں بازو کے عناصر سے بھی نمٹنے کا فیصلہ ہوا تھا کیونکہ پی پی ایل بائیں بازو کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس بناء پر پی پی ایل پر حکومتی قبضے کا فیصلہ ہوا۔ (۱۵)

حکومت نے پی پی ایل پر قبضہ کے لیے سیکورٹی آف پاکستان (ترمیمی) آرڈیننس 16 اپریل کو جاری کیا۔ اس ترمیمی آرڈیننس کے تحت میاں افتخار الدین کی ملکیت کو چھین لیا گیا۔ اسٹیبلشمنٹ نے ملٹری آپریشن کی طرز پر پی پی ایل پر قبضے کا آپریشن کیا۔ آپریشن کی نگرانی دو مقامات سے کی گئی جنھیں ہیڈکوارٹر کہا گیا۔ A ہیڈکوارٹر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی رہائش گاہ پر قائم کیا گیا تھا اور B ہیڈکوارٹر لاہور جم خانہ کلب میں قائم کیا گیا۔ پولیس نے میاں افتخار الدین اور سید امیر الدین شاہ کی قیام گاہوں اور پی پی ایل کے دفاتر پر چھاپے مارے۔ میاں افتخار الدین پر غیر ملکی طاقتوں سے فنڈ لینے اور نظریاتی سرحدوں کی خلاف ورزی کے الزامات لگائے گئے مگر یہ الزامات کسی عدالت میں ثابت نہ ہو سکے۔ حکومت نے مارشل لاء ریگولیشن 72 کے تحت پی پی ایل پر حکومت کے قبضے کو اعلیٰ عدالت میں چیلنج کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ حکومت نے میاں افتخار الدین اور امیر حسین کے وکلاء کو بار بار درخواستوں کے باوجود اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ ان دستاویزات کا معائنہ کر سکیں جو حکام کے بقول میاں افتخار اور امیر حسین شاہ کی رہائش گاہوں سے برآمد ہوئی تھیں۔ حکومت نے عدالتی معاملات کے طے ہونے سے پہلے میاں افتخار الدین سے چھینے گئے شیئرز نیلام کر دیئے۔ حکومت نے ڈائریکٹر پبلک ریلیشن مغربی پاکستان محمد سرفراز کو پی پی ایل کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا اور اس وقت کے سب سے بڑے سرمایہ کار احمد داؤد نے پی پی ایل کے حصص خرید لیے۔ پی پی ایل 1964 میں نئے قائم کیے جانے والے نیشنل پریس ٹرسٹ (NPT) میں شامل کر دیا گیا۔ 1959 سے 1964 تک سیٹھ داؤد، چوہدری محمد حسین اور چوہدری ظہور الٰہی پی پی ایل کے مالکان رہے۔ گو کہ نئے مالکان نے اعلان کیا کہ پی پی ایل کے اخبارات کی آزادانہ پالیسی برقرار رہے گی مگر یہ تینوں ایوب حکومت کے حامیوں میں شامل تھے،

یوں اخبارات کی پالیسیوں میں تبدیلیاں آئیں۔(۱٦)

این پی ٹی کے ایک چیئرمین غلام فاروق نے ستمبر 1964 میں راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ان کی خواہش ہے کہ این پی ٹی کا ہر اخبار لندن ٹائمز، نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ بن جائے۔ پاکستان ٹائمز کے سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر طاہر مرزا کا کہنا ہے کہ اگرچہ حکومت نے بنیادی پالیسی تبدیل کردی تھی مگر باقی پالیسی کا تعین ہر اخبار کی انتظامیہ کررہی تھی۔ان کا کہنا تھا کہ اس وقت کے صدر ایوب خان کی والدہ کے انتقال پر پریس ایڈوائس موصول ہوئی کہ صدر کی والدہ کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اداریہ تحریر کیے جائیں مگر پاکستان ٹائمز میں کوئی اسسٹنٹ ایڈیٹر اس موضوع پر اداریہ لکھنے کو تیار نہیں ہوا، یوں معاملہ ٹال دیا گیا جبکہ روزنامہ ڈان میں صدر ایوب خان کی والدہ کی شان میں ایک زبردست اداریہ لکھا گیا۔(۱۷)

میاں افتخار الدین طویل جدوجہد کے بعد 1962 میں انتقال کر گئے تو مظلوم عوام کا ایک ہمدرد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

پاکستان ٹائمز سے منسلک آئی اے رحمٰن کا کہنا ہے کہ پی پی ایل کے صحافیوں نے پہلے پی پی ایل کی نئی انتظامیہ پھر نیشنل پریس ٹرسٹ کے خلاف مزاحمت جاری رکھی مگر یہ جدوجہد Between the Lines جاری رہی۔کارٹونسٹ انور علی نے کئی دفعہ مارشل لاء کے خلاف کارٹون بنائے۔آئی اے رحمٰن کا کہنا ہے کہ پاکستان ٹائمز اور امروز کے صحافی 50 کی دھائی سے اسٹیبلشمنٹ کی پالیسیوں کے دباؤ میں کام کررہے تھے، اس بناء پر حکومت کے قبضے کے بعد انہیں بہت زیادہ فرق نہیں پڑا۔آئی اے رحمٰن نے اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں مزید کہا کہ ایوب حکومت نے کسی حد تک آزادئ صحافت پر پابندیاں عائد کی تھیں مگر بہت سارے موضوعات پر لکھنے کی آزادی تھی۔ بقول رحمٰن صاحب تعلیم اور کسانوں کے بارے میں کھل کر لکھا جاسکتا تھا مگر امریکہ سے تعلقات کے تناظر میں پابندیاں لگائی گئی تھیں۔(۱۸)

مارچ 1963 میں پاکستان ٹائمز کے مشرقی پاکستان کے ضلع ڈھاکہ میں کریمنل پینل کوڈ کے سیکشن 144 کے تحت داخلے پر پابندی لگادی گئی۔ 27 مارچ کے اخبار میں خبر شائع کی گئی کہ ڈھاکہ کے ڈپٹی کمشنر نے 8 پاکستانی اور 2 ہندوستانی اخبارات کی ضلع بھر میں تقسیم اور سرکولیشن پر

پابندی لگادی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس کی وضاحت شائع کی گئی۔ 28 دسمبر 1968 کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس شوکت علی نے نوٹس جاری کیا جو پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے ایک حصہ دار سید امیر حسین شاہ کی رٹ پر جاری ہوا جس میں پی پی ایل کے حسابات کے سلسلے میں این پی ٹی کو سروس چارجز کے تین لاکھ روپے کا معاملہ زیرِ بحث لانے کے لیے اجلاس بلوانے کو کہا گیا تھا۔ پٹیشن میں کہا گیا کہ پی پی ایل کے تمام حصص پر میاں افتخارالدین مرحوم اور ان کے بیٹے عارف افتخار کا کنٹرول تھا جو حکومتی کنٹرول کے بعد چوہدری محمد حسین اور دیگر کو 47 لاکھ روپے میں بیچ دیئے گئے۔ یہ تمام حصص بعد میں چوہدری ظہور الٰہی کو فروخت کر دیئے گئے جنہوں نے 50 لاکھ روپے نیشنل بینک سے قرضہ کے طور پر لئے تھے۔ دو سال بعد این پی ٹی نے فیصلہ کیا کہ چوہدری ظہور الٰہی کو حصص فروخت کرتے ہوئے سروس چارجز اس وقت کے معیار کے مطابق 56 لاکھ روپے ادا کیئے جائیں۔ یہ پی پی ایل کے ایک حصہ کی رقم وصولی کا معاملہ تھا جو مؤثر طور پر کارگر اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکا۔ پاکستان ٹائمز میں فلم انڈسٹری پر آزادانہ طور پر تنقید کی گئی۔ فلم پروڈیوسرز اس سے ناراض ہوگئے۔ اکتوبر 1967 سے لے کر فروری 1968 تک پاکستان ٹائمز بغیر فلمی اشتہارات کے شائع ہوتا رہا۔ بعد میں ایک معاہدے پر اتفاق رائے کے بعد فلمی اشتہارات شائع ہونا شروع ہوئے۔ 1960 میں نئی انتظامیہ نے پاکستان ٹائمز کے راولپنڈی ایڈیشن کا آغاز کیا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی گئی۔ پاکستان ٹائمز میں شہر کی ثقافتی وسماجی سرگرمیوں اور عوامی دلچسپی کے دیگر موضوعات زیادہ نمایاں انداز میں شائع ہونے لگے۔ اس دوران اخبار کے صفحات میں اضافہ ہوا۔ اخبار نے ترقی پسند عناصر کی حمایت کے بجائے رجعت پسند اور بنیاد پرستوں کی مخالفت شروع کردی، خاص طور پر مذہبی وسیاسی جماعتوں پر کڑی تنقید کی جانے لگی۔ 1962 میں پی پی ایل کو چوہدری محمد حسین کے حوالے کیا گیا۔ نئی انتظامیہ نے دائیں بازو کے صحافی زیڈ اے سلہری کو چیف ایڈیٹر مقرر کیا جس پر ایڈیٹر احمد علی خان نے استعفیٰ دیدیا۔ پھر اس ادارے کو چوہدری ظہور الٰہی کے حوالے کیا گیا مگر وہ بھی ادارہ چلانے میں ناکام رہے۔ 1964 میں حکومت نے متعدد صنعتکاروں کے تعاون سے نیشنل پریس ٹرسٹ قائم کیا۔ پی پی ایل این پی ٹی کا یونٹ بن گیا۔ این پی ٹی کے قیام کے بعد خواجہ آصف کو ایڈیٹر اور کرنل مجید ملک کو

مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔(۱۹)

پی پی ایل کے صحافیوں نے ٹریڈ یونین تحریک کو منظّم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ایوب خان حکومت کی پی پی ایل پر قبضے کی مخالفت کی۔حکومت کی پی پی ایل پر کارروائی کے بعد ڈھاکہ میں پی ایف یو جے کی ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس ہوا۔پی پی ایل کے صحافی حمید ہاشمی نے اجلاس میں قرارداد پیش کی جس میں پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار پر حکومت کے قبضے کی مذمت کی گئی تھی اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ پی پی ایل کو اس کے حقیقی مالک میاں افتخارالدین کے حوالے کیا جائے۔یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی۔سیکریٹری داخلہ نے حمید ہاشمی سے وضاحت طلب کی مگر پی پی ایل کے ایڈمنسٹریٹر سرفراز احمد نے مداخلت کی اور یہ مؤقف اختیار کیا کہ کارروائی کسی فرد کے بجائے پی ایف یو جے کے خلاف ہونی چاہئے۔یوں یہ معاملہ داخلِ دفتر ہوا۔(۲۰)

منہاج برنا آزادیٔ صحافت اور صحافیوں کے حالات کار کے عظیم کارکنوں میں سے ایک تھے۔انہوں نے آزادیٔ صحافت، صحافیوں اور کارکنوں کو تنخواہیں اور مراعات دلوانے کے لیے ساری زندگی جدوجہد کی۔منہاج برنا ہمیشہ صحافیوں کی تحریک کو مزدور طبقے کی جدوجہد سے منسلک کرنے میں مصروف رہے۔انہوں نے 1950 میں کراچی میں روزنامہ امروز میں رپورٹر کی حیثیت سے ملازمت کی۔پھر امروز کراچی بند ہونے کے بعد وہ روزنامہ پاکستان ٹائمز کراچی کے بیورو چیف بن گئے۔برنا نے 1963 میں پریس اینڈ پبلکیشن آرڈیننس کے خلاف اے پی این ایس، سی پی این ای اور پی ایف یو جے کی تحریک کو منظّم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔منہاج برنا نے جنرل ضیاءالحق کے دور میں روزنامہ مساوات پر پابندی کے خلاف کراچی اور لاہور میں چلنے والی تحریکوں کی قیادت کی اور سکھر جیل میں طویل عرصے تک بھوک ہڑتال کی۔اس تحریک میں صحافیوں کو کوڑے مارے گئے۔منہاج برنا نے گورنر مغربی پاکستان نواب کالا باغ کی بیماری اور گورنری سے عہدہ چھوڑنے کی خبر فائل کی جو پاکستان ٹائمز میں شائع ہوئی۔اس خبر کی بناء پر گورنر کالا باغ اور پی پی ایل کے مالک چوہدری ظہور الٰہی کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔چوہدری ظہور الٰہی نے منہاج برنا پر زور دیا کہ وہ اس خبر کا ذریعہ ظاہر کریں۔برنا صاحب نے اعلیٰ صحافتی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے سورس (Source) بتانے سے انکار کیا۔منہاج برنا کو ملازمت سے

معطل کردیا گیا مگر پی ایف یو جے نے تحریک چلائی۔ برنا صاحب بحال ہوئے اوران کا تبادلہ ڈھاکہ کردیا گیا۔(۲۱)

پاکستان ٹائمز کی ایک اہم خصوصیت انور علی کے کارٹون تھے۔انور علی ایک سیکولر،لبرل اوراینٹی مولوی نظریات کے حامل تھے۔وہ عام آدمی کے مسائل پر کارٹون بناتے۔انہوں نے 31 جنوری 1947 کو پاکستان ٹائمز میں شمولیت اختیار کی اورجنوری 1977 تک پاکستان ٹائمز سے منسلک رہے۔انہوں نے پہلے سیاسی کارٹون تخلیق کیے، پھرایک کریکٹر''ننھا'' روشناس کرایا۔ننھا کے کردار کا پہلا کارٹون 1953 میں شائع ہوا۔

پاکستان ٹائمز کے فوٹوگرافر ایف ای چوہدری بقول خالدحسن بابائے پریس فوٹوگرافر کہلانے کے مستحق ہیں۔ایف ای چوہدری نے 1949 میں پاکستان ٹائمز میں ملازمت کی۔وہ پاکستان کے پہلے فل ٹائم فوٹوگرافر تھے۔ایف ای چوہدری 30 برسوں تک اس شعبے سے منسلک رہے۔انہوں نے نئے سال کے سورج طلوع ہونے سے لے کر بہت سے نئے موضوعات فوٹو جرنلزم میں شامل کرائے۔ایف ای چوہدری جو چاچا چوہدری کہلاتے تھے عام آدمی کے مسائل کو اپنی فوٹوگرافی کا محور بناتے تھے۔امریکی سفارت کار Witos نے چاچا کو One Shot Man قرار دیا تھا۔روزنامہ ڈان لاہور کے فوٹوگرافر اظہر جعفری مرحوم کا کہنا تھا کہ ایف ای چوہدری لاہور کے حقیقی کردار تھے۔

سنڈے ایڈیشن: پاکستان ٹائمز نے 23 نومبر 1947 کو پاکستان ٹائمز میگزین کے نام سے اپنا سنڈے ایڈیشن شروع کیا۔یہ سنڈے میگزین بھٹو دور میں اتوار کو عام تعطیل کے خاتمے تک جاری رہا۔اس وقت سنڈے ایڈیشن الگ سے چار صفحات پر نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ اخبار کے اندرونی صفحات کا حصہ ہوتا تھا۔آغاز میں اس کے صفحات مضامین اورفیچرز میں تقسیم ہوتے تھے جو بچوں اور خواتین قارئین کے لیے ہوتے تھے اورفلموں اور کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے تھے۔میگزین میں بین الاقوامی موضوعات پرمضامین بھی شائع ہوتے تھے۔اس میں تاریخی واقعات وشخصیات پر مضامین کے علاوہ سماجی،ثقافتی،سائنس اورآرٹس سے متعلق فیچرز بھی شائع کیے جاتے تھے۔

این پی ٹی کو بظاہر خودمختارادارہ کہا گیا مگراخبار سرکاری پالیسی پرہی کام کرتا رہا۔1968

کے آخر میں جب ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک شروع ہوئی اور ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو اس سے پاکستان ٹائمز نے بھی دیگر اخبارات کی طرح فائدہ اٹھایا اور ایوب حکومت کے مخالف مختلف شہروں میں ہونے والے جلسے جلوسوں کی خبریں شائع ہونے لگیں۔ پولیس نے جب اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی تو کراچی، ڈھاکہ اور راولپنڈی وغیرہ میں مظاہرین جاں بحق ہوئے اور مختلف شہروں میں کرفیو لگا دیا گیا۔ پاکستان ٹائمز نے یہ سب خبریں تفصیل سے شائع کیں مگر یہ مختصر دور پانچ مہینے تک رہا۔ پھر جنرل یحییٰ خان نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ پی پی ایل کے صحافی اور غیر صحافتی عملہ ٹریڈ یونین تحریک میں آگے رہا۔ پی پی ایل ورکرز یونین کے پہلے سیکریٹری محمود سلطان کا کہنا ہے کہ میاں افتخار الدین کے زمانے میں یونین بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس زمانے میں ایک ورکرز یونین تھی۔ 1970 میں پی پی ایل ورکرز یونین کا قیام عمل میں آیا۔ پہلے صدر اے ٹی چوہدری اور سیکریٹری محمود سلطان مقرر ہوئے۔ اے ٹی چوہدری بعد میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس 50 کی دھائی سے فعال تھی۔ پی ایف یو جے اور پی پی ایل ورکرز یونین نے صحافیوں اور دیگر عملے کی تنخواہوں اور مراعات دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ پی ایف یو جے کی کوششوں سے اگست 1964 میں جرنلسٹ ویج بورڈ قائم ہوا۔ 1970 میں پی ایف یو جے نے عبوری امداد اور غیر صحافتی عملے کو ویج بورڈ کے دائرے میں شامل کرنے کے لیے ہڑتال کی۔ اس 10 روزہ ہڑتال میں پی پی ایل کے اخبارات سمیت پورے ملک کے اخبارات شائع نہیں ہوئے۔ ہڑتال کے خاتمے پر مختلف اخبارات اور نیوز ایجنسیوں سے 200 کے قریب صحافیوں اور کارکنوں کو برطرف کیا گیا۔ ان میں سے 40 صحافیوں کا تعلق پاکستان ٹائمز اور روزنامہ امروز سے تھا۔ برطرف ہونے والوں میں منہاج برنا، عبداللہ ملک، حمید اختر، آئی اے رحمٰن اور عباس اطہر شامل تھے۔ پی پی ایل ورکرز یونین کے انتخابات میں معروف ادیب صحافی صفدر میر کو صدر منتخب کیا گیا۔ جنوری 1971 میں صفدر میر کی قیادت میں یونین نے پی پی ایل کو اس کے حقیقی مالکان کے حوالے کرنے اور ہڑتال کے دوران برطرف کیے گئے 42 صحافیوں کی بحالی کے لیے تحریک شروع کی۔ پی پی ایل کے کارکنوں نے 6 جنوری 1971 کو پی پی ایل کے دفتر کے سامنے احتجاجی دھرنا شرع کیا اور بھوک

ہڑتال شروع کردی۔ پیپلز پارٹی پنجاب کے معروف رہنما حنیف رائے، محمود علی قصوری، شیخ رشید اور حفیظ کاردار وغیرہ نے احتجاجی دھرنے میں شرکت کی اور تقاریر کیں۔ اس تحریک میں پیپلز پارٹی کے قومی اسمبلی کے منتخب اراکین مختار رانا، احمد رضا قصوری اور عبدالحفیظ کاردار نے زوردار بیان دیئے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پی پی ایل کے کارکن نیشنل پریس ٹرسٹ پر قبضہ کریں گے۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو خدشہ محسوس ہوا کہ اگر پی پی ایل کے صحافیوں نے این پی ٹی پر قبضہ کیا تو یہ کارکنوں میں دوسرے اداروں پر قبضے کی روایت مستحکم ہو جائے گی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ہڑتال کو تماشہ قرار دیا اور ہڑتال ختم کرنے کو کہا جس پر لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے پولیس ایکشن کیا اور ہڑتالی کیمپ کو پی پی ایل کے دفتر سے ہٹا کر بہت دور اقبال پارک میں منتقل کر دیا مگر ذوالفقار علی بھٹو نے 1970 کی ہڑتال کے دوران نکالے جانے والے صحافیوں کی بحالی کا وعدہ کیا اور برسر اقتدار آنے کے بعد 1972 میں بیشتر صحافیوں کو ان کے اداروں میں بحال کر دیا گیا۔ (۲۲)

پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں پاکستان ٹائمز نے آزادیٔ صحافت کا استعمال کیا۔ منتخب حکومت کے خلاف 1977 میں چلنے والی تحریک کے پس پشت عناصر کے خلاف خبریں، آرٹیکل اور اداریے شائع ہوئے۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں زیڈ اے سلہری پھر چیف ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ پاکستان ٹائمز صرف حکومت کا ترجمان بن گیا مگر 1983 میں ایم آر ڈی کی تحریک بحالیٔ جمہوریت کے دوران جب سندھ میں مظاہرین پر فوج نے فائرنگ کی تو پاکستان ٹائمز میں تاریخی آرٹیکل، تجزیے اور اداریے شائع ہوئے مگر بے نظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے ساتھ 6 اگست 1990 کو چیف ایڈیٹر آئی اے رحمٰن اور ایڈیٹر عزیز صدیقی مستعفی ہو گئے۔ پاکستان ٹائمز 25 مئی 1996 کو بند ہو گیا مگر پاکستان ٹائمز نے جمہوریت کے ارتقاء، بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ، مظلوم طبقات، مزدوروں، کسانوں، خواتین اور اقلیتوں کے حقوق کے لیے جو آوازیں بلند کیں اور پاکستان کے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ کردار کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی اس کے نتیجے میں عوام کا شعور بھی بلند ہوا اور جمہوری تحریک مستحکم ہوئی۔ (۲۳)

پاکستان ٹائمز 29 ستمبر 1956 کے ایڈیٹوریل میں لکھتا ہے کہ ”سوال اٹھایا گیا کہ

قانون سازی کرنے والے اراکین کے انتخاب کے لیے جداگانہ طرز کا انتخاب اختیار کیا جانا چاہیے؟'' اگر چہ اس سوال کا اسلام کے کسی بھی اصول سے دور دور تک کا کوئی واسطہ نہیں۔ 6 اکتوبر 1956 کو اخبار پاکستان ٹائمز لکھتا ہے کہ ماضی میں سیاسی طرز حکومت کو مذہبی اتھارٹی کے رنگ میں رنگنے کی جو کوشش کی گئی تھی وہ دراصل اسلامی نظریہ کو مسخ کرنے کی ایک تکلیف دہ غلطی تھی، عقلی سوچ کو ملامت کرنے سے اسلام کی کوئی خدمت ہے نہ ہی سیاست کی۔ اخبار مزید لکھتا ہے کہ ریاست کی نظریاتی اساس اور عوامی نمائندگی کے درمیان بھی اس عمل کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔ ریاست کی کوئی بھی جمہوری طرز حکومت ہو، اس میں کمیونٹی کی اکثریت کسی بھی نظریہ کو پھیلانے اور اسے اختیار کرنے میں مکمل آزاد ہے، بشرطیکہ اس میں طاقت اور زور زبردستی کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ تو پھر ایک اقلیتی کمیونٹی کے لیے جداگانہ طرز انتخاب کسی بھی ریاست کے لیے کس طرح ناگزیر ہو سکتا ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب کسی بھی دانشور کے پاس موجود نہیں۔

پاکستان ٹائمز 6 اکتوبر 1956 کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ مسلم اکثریتی ضرورت اور امنگوں کے مطابق وحدت کی تشکیل ہونا چاہئے، یہی طرز ریاست دیگر مسلم ریاستوں میں بھی اختیار کیا گیا ہے اور پاکستان بھی ایک مسلم ریاست ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاست کی اکثریتی عوام کو مساوی رکنیت کا اہل ہونا چاہیے۔ ریاست پر مشترکہ اعتماد و یقین رکھنا چاہیے، وہ لوگ جو فرقہ واریت کو پروان چڑھاتے ہیں وہ دراصل ریاست کے خلاف ایک بغاوت کا کام کرتے ہیں جو ریاست کی سالمیت کے لیے خطرہ کے باعث ہیں۔

پاکستان ٹائمز 19 فروری 1956 کی اشاعت میں تحریر کرتا ہے کہ جداگانہ طریقہ انتخاب پاکستان میں ہندو کمیونٹی کو ایک پاکستانی قومیت سمجھنے کے بجائے ان میں ایک علیحدہ قومیت اختیار کرنے کا رجحان پیدا کرے گا جو ملکی سالمیت کے لیے انتہائی خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے چونکہ اس رجحان سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہونگی۔ ریاست کے اندر ایک اور ریاست نیز ہندو کمیونٹی میں عسکریت پسندی کا رجحان بھی پروان چڑھ سکتا ہے۔ ہندو اور مسلم کمیونٹیز میں جو ہمدردی اور رواداری برقرار ہے اسے سخت دھچکا لگے گا۔ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنی معاشی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور زندگی کی بقاء کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی جداگانہ طرز انتخاب کی

کوئی قانونی یا اخلاقی توجیہہ موجود نہیں تھی۔

پاکستان ٹائمز 29 ستمبر 1956 کے ایڈیٹوریل میں تحریر کرتا ہے کہ غیر مسلموں کی بڑی تعداد نے جداگانہ طرز انتخاب کی نہ صرف سخت مخالفت کی بلکہ اسے منسوخ کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔ مسلمانوں میں جن لوگوں نے جداگانہ طرز انتخاب کی حمایت کی تھی اس کی بنیاد تعصب، نفرت اور خوف تھی۔ پاکستان ٹائمز کے 30 جولائی 1956 کے ایک اور ایڈیٹوریل میں لکھا گیا ہے کہ جداگانہ طرز انتخاب اقلیتی خدشات و بے چینی کو دور کرنے کے لیے ایک عارضی انتظام ہے اور جب اقلیت اپنے مستقبل کے بارے میں اطمینان اور خوشی کا اظہار کرے تو اس طرزِ انتخاب کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کی اقلیت جداگانہ طرز انتخاب کی سخت مخالف رہی ہے، وہ سیاسی قومی دھارے میں اکثریت کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتی ہے۔ جو لوگ اقلیت کو جداگانہ طرز انتخاب کے لیے راغب کرنا چاہتے ہیں ان کا تعلق فرقہ واریت اور نسلی تعصب سے ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اقلیت تو مطالبہ نہیں کرتی کہ اکثریت کے نام پر اقلیت کو جداگانہ انتخاب پر مجبور کیا جائے۔

پاکستان ٹائمز اپنے ایڈیٹوریل میں لکھتا ہے کہ اس وقت کے صدر نے ایک پریس کانفرنس میں پاکستان کے جمہوری مسائل پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مسئلہ پاکستان میں رائج جمہوریت میں نہیں بلکہ آئین میں روایتی اور آئینی پروونژن کو بائی پاس اور نظرانداز کرنے سے ہوا ہے۔ قانون ساز ادارے انتظامیہ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی انتظامیہ قانون ساز اداروں کو جبکہ الیکٹوریٹ کو ان دونوں کو کنٹرول کرنا مشکل ہے۔ اخبار مزید لکھتا ہے کہ سیاسی نظام میں اصلاح یا ریفارم لانے کے لیے کوئی تبدیلی لانا بہت مشکل ہے۔

ایوب خان کی حکومت نے جب پی پی ایل کے اخبارات پر قبضہ کیا تو پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خان نے استعفیٰ دیدیا اور احمد علی خان قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ احمد علی خان نے 3 سال ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے اور جب زیڈ اے سلہری کو پاکستان ٹائمز کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا تو انہوں نے استعفیٰ دیدیا۔ احمد علی خان نے ایک انٹرویو میں پاکستان ٹائمز کے تجزیہ کو یوں بیان کیا:

سوال: پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے ادارے میں مالکان اور صحافیوں کے آپس میں

تعلقات کیسے تھے؟

پی پی ایل میں مالکان اور کارکن صحافیوں کے تعلقات عمومی طور پر خوشگوار تھے۔ صحافیوں کی تنخواہیں اور مراعات دیگر اکثر اشاعتی اداروں سے بہتر تھیں۔

سوال: کیا انتظامیہ اخبار کی پالیسی میں یا ایڈیٹر کے کام میں کوئی مداخلت کرتی تھی؟

پاکستان ٹائمز کی بنیادی پالیسی انتظامیہ نے بالخصوص پی پی ایل کے چیئرمین میاں افتخار الدین نے متعین کی تھی۔ یہ پالیسی کافی حد تک بائیں بازو کے نظریات سے ہم آہنگ تھی۔ اس پالیسی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ایڈیٹر آزاد تھا کہ وہ خبروں کو منتخب کرے، ان کو ایڈیٹ کرے اور ان کی اہمیت کا تعین کرے۔ اس طرح اداریوں میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ بھی ایڈیٹر کے اندازِ فکر کا نتیجہ ہوتا تھا۔ چیئرمین کی طرف سے پالیسی معاملات میں مداخلت کی ضرورت اس لیے بھی نہ تھی کہ پہلے ایڈیٹر فیض احمد فیض اور دوسرے ایڈیٹر مظہر علی خان انتظامیہ کے ہم خیال، ہم مشرب اور ہم مسلک تھے۔ چند مواقع ایسے پیدا ہوئے ہونگے جب میاں صاحب نے سینئر اسٹاف کو بلا کر بریفنگ دی ہو، البتہ انفرادی طور پر میاں صاحب کا فیض صاحب، مظہر علی صاحب اور مجھ سے رابطہ رہتا تھا اور اس دوران اکثر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔

سوال: کیا میاں افتخار الدین اپنے اخبارات کو ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کرتے تھے؟

ذاتی مقاصد کے لیے اخبار کے استعمال کی مجھے کوئی خاص مثال یاد نہیں البتہ یہ بالکل واضح بات ہے کہ اخبار کی پالیسی پر میاں صاحب کے اندازِ فکر اور نظریات کی گہری چھاپ تھی۔ وہ بے انتہا ذہین اور قابل سیاست دان تھے اور ان کی سیاسی شخصیت سے ایڈیٹر سمیت سارا سینئر اسٹاف متاثر تھا۔ وہ سیاسی مقاصد کے لیے اپنے اخبارات کو ضرور استعمال کرتے تھے۔ ان کا اخبار نکالنے کا بنیادی مقصد تو یہی تھا۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ فیض احمد فیض کی صحافت کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے؟

فیض صاحب کا صحافتی کیریئر مارچ 1947 سے شروع ہوتا ہے۔ جب وہ فوج کے شعبہ تعلقات عامہ میں کرنل تھے۔ میاں افتخار الدین جب اخبار نکالنے لگے تو بریگیڈیئر ڈسمنڈ ینگ نے میاں صاحب سے فیض صاحب کی ملاقات کروائی۔ لہٰذا انہیں پاکستان ٹائمز کا ایڈیٹر بنا دیا

گیا۔ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتاری کے دوران وہ شاعری اور سیاست کرتے رہے۔ حیدرآباد جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ دوبارہ چیف ایڈیٹر کے طور پر آ گئے۔اس محدود وقت میں وہ اداریہ نویسی کرتے رہے۔ایک ماہ میں چار پانچ اداریئے وہ خود لکھتے تھے۔ مجھے اور مظہر علی خان کو وہ پالیسی بریف کیا کرتے تھے۔اداریئے ہمارے علاوہ کمال حیدر، جمیل احمد، خواجہ آصف اور زبیر صدیقی وغیرہ سبھی لکھتے تھے۔ نیوز روم میں کام کرنے والے خاص تربیت یافتہ تھے۔ نیوز مینجمنٹ اور ڈسپلے وغیرہ یہ سبھی کام وہی کرتے تھے۔ لے آؤٹ بھی وہ خود ہی بناتے تھے۔فیض صاحب کو اس کا آئیڈیا نہیں تھا البتہ اپنی رائے کا اظہار ان کا کام تھا۔ وہ کل چار سال کا دور بنتا ہے۔ان کا نام محض ''امروز'' اور ''لیل ونہار'' پر چھپتا تھا۔

سوال: آپ کے خیال میں آپ نے اس وقت صحافت کے ذریعے جن ملکی معاملات کی طرف توجہ دلائی ان کے کیا نتائج واثرات مرتب ہوئے؟

دیکھیں ایڈیٹر اپنے قارئین، مالکان اور حکومت کو جوابدہ ہوتا ہے۔ ہماری پالیسی تو مالکان وضع کرتے تھے لیکن ہم اپنے علم وتجربے کی روشنی میں یہ سمجھتے تھے کہ ملکی بجٹ کا کافی حصہ تعلیم اور صحت پر خرچ ہونا چاہیے۔ہم یہ اپنی تحریروں میں مطالبہ کیا کرتے تھے لیکن افسوس کسی نے اثر قبول نہیں کیا۔ہم کہتے تھے کہ ہماری خارجہ پالیسی خودمختار ہونی چاہئے، اس پر عمل نہیں ہوا۔ہم اکثر لکھا کرتے تھے کہ ملک کے معاشی استحکام کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ زرعی اصلاحات کی جائیں اور کاشتکاروں کی حالت بہتر بنائی جائے کیونکہ اس سے ذرائع آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ہم جمہوری لائن اختیار کرتے تھے اور لوٹ مار کی مخالفت کرتے تھے۔ہم چاہتے تھے کہ جیلوں میں اصلاحات کی جائیں اور سب سے بڑھ کر انگریز کے بنائے ہوئے صحافتی قوانین تبدیل کیے جائیں لیکن حکومتوں پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ رائے عامہ کے رہنماؤں پر بالخصوص مسٹر بھٹو پر اس کا تھوڑا بہت اثر ہوا۔انہوں نے زرعی اصلاحات اور اسٹیل مل کی بات کی۔ جو نوجوان سیاست میں آئے ان کو ہم نے متاثر کیا۔ میں نے ذاتی طور پر دس بارہ اداریئے اس موضوع پر لکھے کہ جب تک اسٹیل مل نہیں ہوگی ملک ترقی نہیں کرسکتا، کیونکہ ہر چیز میں لوہا استعمال ہوتا ہے۔ جب بھٹو صاحب ایک نوجوان کے طور پر پاکستان آئے تھے تو وہ ہارورڈ سے یہ سب کچھ

پڑھ کر تو نہیں آئے تھے، ہمارے اخبار کو پڑھ کر ہی وہ متاثر ہوئے تھے۔

سوال: ''ڈان'' اور ''پاکستان ٹائمز'' میں اور پہلے یا موجودہ زمانے میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

بنیادی فرق یہ بہت بڑا ہے کہ ٹیکنیکس میں بہت تبدیلی واقع ہوئی ہے۔اس زمانے میں صحافت کی ٹیکنیکس ہمیں نہیں آتی تھیں۔خبر، انٹرویو اور فیچر وغیرہ کیسے لکھتے جاتے ہیں شروع میں ہمیں نہیں پتہ تھا۔ہم اس وقت موضوعات کی وسعت کو ناممکن خیال کرتے تھے۔اب موضوعات کا تنوع ہے۔1973ء کے ''ڈان'' میں اور اب کے ''ڈان'' میں بہت زیادہ فرق ہے۔اس وقت صفحات کم تھے اور اب بہت زیادہ ہیں۔اس وقت پانچ چھ افراد ہی ایڈیٹر کے نام خطوط لکھتے تھے اور چند مضامین آتے تھے۔اب حالت یہ ہے کہ میرے پاس تین چار سو تحریریں روزانہ آتی ہیں۔اب لوگوں کی اخبارات سے وابستگی اور دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے اور ان کے رسپانس بہت بڑھ گئے ہیں۔اب چلتے چلاتے ای میل اور فیکس کے ذریعے ہر کوئی کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ان سبھی حوالوں سے بڑا زبردست فرق پڑا ہے۔لہٰذا اس وقت کے ''پاکستان ٹائمز'' اور آج کے ''ڈان'' میں بھی آپ کو واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سبحانی (ڈاکٹر) میمونہ، ہم سفیرانِ فیض، شمع بکس، فیصل آباد، 2017ء، صفحہ 13

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ ناز (ڈاکٹر) احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ 77

۷۔ خان، (ڈاکٹر) توصیف احمد خان، آزادیٔ صحافت کی جدوجہد میں اخباری تنظیموں کا کردار، کراچی پریس کلب، صفحہ 33

۸۔ رحمٰن، آئی اے، ذاتی انٹرویو، یکم جون 2017، لاہور

۹۔ Usmani, Irfan Waheed, Print Culture and Left Wing Radicalism in Ph.D, Lahore, Pakistan, Unpublished Thesis, National University of Singapore, Page 78

۱۰۔ رحمٰن، آئی اے، ذاتی انٹرویو، یکم جون 2017، لاہور

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ Usmani, Irfan Waheed, Print Culture and Left Wing Radicalism in Ph.D, Lahore, Pakistan, Unpublished Thesis, National University of Singapore, Page 79

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ نیازی، ضمیر، صحافت پابند سلاسل، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی، صفحہ 120

۱۵۔ رحمٰن، آئی اے، ذاتی انٹرویو، یکم جون 2017ء، لاہور

۱۶۔ نیازی، ضمیر، صحافت پابند سلاسل، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی، صفحہ 121,122

۱۷۔ رحمٰن، آئی اے، ذاتی انٹرویو، یکم جون 2017ء، لاہور

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ناز (ڈاکٹر) احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ 79,80

۲۰۔ نیازی، ضمیر، صحافت پابند سلاسل، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی، صفحہ 123

۲۱۔ برنا، منہاج، سابق صدر پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس، راولپنڈی، ذاتی انٹرویو، جنوری 2016

۲۲۔ سبحانی، (ڈاکٹر) میمونہ، ہم سفیرانِ فیض، شمع بکس، فیصل آباد، 2017، صفحہ 41

۲۳۔ رحمٰن، آئی اے، ذاتی انٹرویو، یکم جون 2017، لاہور

روزنامہ مساوات

ملک میں سیاسی جماعتوں کے ترجمان اخبارت کی اشاعت کی تاریخ خاصی قدیم ہے۔محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے پیغام کی ترویج کے لیے انگریزی اخبار روزنامہ ڈان اور اردو کا اخبار منشور شائع کیا۔ جماعت اسلامی نے پہلے روزنامہ تسنیم اور 70 کی دھائی میں روزنامہ جسارت شائع کیا۔

1970 میں صحافیوں کی دس روزہ ہڑتال کے اختتام پر ترقی پسند صحافیوں کو اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں سے نکال دیا گیا۔نکالنے جانے والے صحافیوں کی اکثریت پیپلز پارٹی کے حامیوں میں تصور کی جاتی تھی۔ان صحافیوں کی برطرفی سے پیپلز پارٹی کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اب اخبارات میں پیپلز پارٹی کے پیغام کے لیے جگہ محدود ہوگئی ہے۔یہی وجہ تھی کہ پیپلز پارٹی نے اپنا اخبار روزنامہ مساوات شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔پیپلز پارٹی کے دانشور رکن حنیف رامے کا شمار ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔اُردو کے ہفت روزہ رسالہ نصرت شائع کرنے سے پہلے اسلامی سوشلزم اور مساوات کا نعرہ بلند کیا۔حنیف رامے ایک اعلیٰ پائے کے کیلی گرافر اور مصنف تھے،یوں حنیف رامے کو روزنامہ مساوات کا پہلا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔پاکستان پیپلز پارٹی 1970 میں ہالہ کانفرنس میں اپنا ترقی پسندانہ منشور منظور کرا چکی تھی۔(۱)

حنیف رامے نے اس چار نکاتی منشور کی بنیاد پر روزنامہ مساوات کا 7 جولائی 1970 کو اپنا پہلا اداریہ تحریر کیا۔

روزنامہ مساوات کی ابتدائی ٹیم میں احمد شبیر،شفت تنویر مرزا،عباس اطہر نمایاں تھے۔منو بھائی اپنا کالم گریباں لکھتے تھے۔پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما اسلم گورداس پوری کی انقلابی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔(۲)

ترقی پسند صحافیوں صفدر میر،عبداللہ ملک،احمد شبیر،نذیر ناجی،منو بھائی،شفقت تنویر مرزا،

محمود مرزا اور پروفیسر فتح محمد ملک کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ مساوات نے ملک کے اقتصادی مسائل کو اپنی بنیاد بنایا۔ اس کے صفحہ اول پر ان تمام رہنماؤں کے بیانات تفصیل سے شائع ہوتے تھے جن سے پیپلز پارٹی کے بنیادی نعرے روٹی، کپڑا اور مکان کو تقویت ملتی تھی۔ پیپلز پارٹی کے چیئر پرسن ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ مولانا مفتی محمود، مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے اس موضوع پر دیئے جانے والے بیانات بھی اخبار کے صفحہ اول اور صفحہ آخر پر شائع ہوتے تھے۔ روزنامہ مساوات نے 1970 کی انتخابی مہم میں پیپلز پارٹی کے ترقی پسندانہ پروگرام کی تشہیر کے لیے جلسے، جلوسوں اور بیانات کو تفصیل سے شائع کیا۔ اس دور کے اخبار کے مطالعہ سے لگتا ہے کہ پنجاب اور سندھ کے ہر ضلع سے کوئی نہ کوئی اہم رہنما اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت پیپلز پارٹی میں شامل ہو رہا تھا۔ اسی طرح جب پیپلز پارٹی نے اپنے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں کا اعلان کیا تو ان امیدواروں کو بھرپور کوریج دی گئی۔ (۳)

روزنامہ مساوات نے پیپلز پارٹی کے بعد نیشنل عوامی پارٹی (NAP) اور جمعیت علمائے اسلام کو کوریج دی۔ نیپ کا منشور سوشلسٹ معیشت کی وکالت کرتا تھا۔ منشور میں جاگیرداری اور قبائلی نظام کے خاتمے اور بینکوں اور صنعتوں کو قومیانے کا ذکر تھا۔ روزنامہ مساوات نے ان نکات کو بھرپور طریقے سے اُبھارا۔ اخبار نے عوامی لیگ کی مشرقی پاکستان میں چلائے جانے والی انتخابی مہم کی بھی کوریج کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے جلسے جلوسوں کی رپورٹنگ کو اہمیت دی گئی۔ خاص طور پر شیخ مجیب الرحمٰن کے سوشلسٹ معیشت کو نافذ کرنے کے وعدے کو نمایاں کیا گیا۔ مغربی پاکستان سے شائع ہونے والے دیگر اخبارات نے عوامی لیگ کی انتخابی سرگرمیوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اسی طرح جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبداللہ انور اور محسن الدین کے ایسے بیانات کو ترجیح دی گئی جن میں سرمایہ داری یا جاگیرداری کے خاتمے اور معاشی مساوات پر مبنی معاشرے کے قیام پر زور دیا گیا۔ روزنامہ مساوات میں معروف ادیب شہزاد منظر کے خطوط شائع ہوتے تھے جن میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے اتحاد پر زور دیا گیا تھا۔ روزنامہ مساوات نے پیپلز پارٹی کی مخالف دائیں بازو کی جماعتوں خاص طور پر جماعت اسلامی، پاکستان جمہوری پارٹی، کونسل مسلم لیگ اور کنونشن مسلم لیگ کے رہنماؤں کے مؤقف اور

ان کے کردار کے تضادات کو اُجاگر کیا اور دائیں بازو کے اخبارات کوہستان، نوائے ملت، چٹان، روزنامہ جسارت اور ہفت روزہ زندگی میں پیپلز پارٹی کے خلاف چلائی جانے والی مہم کا بھرپور جواب دیا گیا۔ روزنامہ مساوات نے بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں، مزدور یونینوں، کسان اور ہاری انجمنوں کے رہنماؤں کے جلسے، جلوسوں اور بیانات کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی اور کالجوں میں بائیں بازو کی طلبہ تنظیم نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) پر اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں کے تشدد کی خبریں شائع ہوئیں اور کراچی یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی بائیں بازو کے طلبہ کے خلاف یک طرفہ کارروائی کے خلاف خبریں، تصاویر اور رپورٹیں شائع کی گئیں۔ (۴)

1970 کے انتخابات میں سندھ اور پنجاب سے پیپلز پارٹی کی کامیابی، سرحد اور بلوچستان سے نیپ اور جمعیت علمائے اسلام اور مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ کی بھرپور کامیابی کے بعد سیاسی صورتحال تبدیل ہوگئی۔ جنرل یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرلیا۔ پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کے صدر یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات ہوئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اقتدار عوامی لیگ کو فوری طور پر منتقل کرنے کا مطالبہ کیا۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین زیڈ اے بھٹو کا مؤقف تھا کہ قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ میں معاہدہ ہونا چاہیے جبکہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنے چھ نکات سے پیچھے ہٹنا چاہیے۔ جنرل یحییٰ خان کسی صورت اقتدار شیخ مجیب الرحمٰن کو منتقل کرنے کے حامی نہیں تھے، یوں پیپلز پارٹی اور فوج کا اتحاد واضح ہوا۔ بھٹو صاحب نے قومی اسمبلی کے مجوزہ اجلاس کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا۔ جنرل یحییٰ خان نے اجلاس ملتوی کردیا۔ عوامی لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام نے عوامی لیگ کی بھرپور حمایت کی۔ جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد اور جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی پہلے مجیب الرحمٰن کو اقتدار منتقل کرنے کی حمایت کررہے تھے مگر مارچ 1971 کے فوجی آپریشن ہوتے ہی ان رہنماؤں نے فوجی آپریشن کی حمایت کردی۔ روزنامہ مساوات کی پالیسی میں تبدیلی آ گئی۔ اب روزنامہ مساوات نے زیڈ اے بھٹو کے مؤقف کے حق میں خبریں، آرٹیکل اور اداریے شائع کرنے شروع کیے۔ (۵)

شیخ مجیب الرحمٰن، ولی خان، میر غوث بخش بزنجو، مفتی محمود، پروفیسر غفور اور شاہ احمد نورانی پر تنقید شروع ہوئی۔ پھر مشرقی پاکستان میں شروع ہونے والے فوجی آپریشن کی حمایت میں اداریے تحریر کیے گئے۔ شفقت تنویر مرزا، جو مساوات میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ سینئر صحافی احمد بشیر اور وہ اداریہ تحریر کرتے تھے۔ ہمارا مؤقف فوجی آپریشن کے خلاف تھا، یوں ایک اداریہ مشرقی پاکستان میں جاری فوجی آپریشن کے خلاف تحریر کیا گیا۔ حنیف رامے شہر میں موجود نہیں تھے، اس بناء پر یہ اداریہ شائع ہوا۔ پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو نے حنیف رامے کو ہدایت کی کہ احمد بشیر اور شفقت تنویر مرزا کو برطرف کیا جائے۔ مرزا صاحب کا کہنا تھا کہ رامے صاحب نے دونوں صحافیوں کی برطرفی کے خط تیار کیے مگر پھر خطوط دینے سے پہلے ایک اجلاس میں رامے صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے برطرفی کے خط پھاڑ دیئے۔(٦)

16 دسمبر 1971 کو پاکستانی فوج کے مشرقی پاکستان میں کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اے کے نیازی نے ریس کورس گراؤنڈ ڈھاکہ میں بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ مشرقی پاکستان میں تعینات 90 ہزار فوجی بھارتی فوج کی قید میں چلے گئے۔ فوجی جنرلوں نے جنرل یحییٰ خان کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ پیپلز پارٹی کے سربراہ جنہیں جنرل یحییٰ خان نے ڈپٹی وزیراعظم اور وزیر خارجہ مقرر کیا تھا نیویارک میں سلامتی کونسل کے اجلاس میں شریک تھے۔ وہ فوراً راولپنڈی پہنچے اور 20 دسمبر 1971 کو زیڈ اے بھٹو نے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ اب روزنامہ مساوات کا کردار تبدیل ہوا۔ یہ حکومت کا ترجمان اخبار بن گیا۔ اب مساوات کے ڈھانچہ میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حنیف رامے پیپلز پارٹی کی پنجاب حکومت میں وزیر بن گئے۔ پنجاب کے گورنر غلام مصطفیٰ کھر روزنامہ مساوات کے نگراں ہوگئے۔ انہوں نے اپنے ساتھی میاں محمد اسلم کو چیف ایگزیکٹو مقرر کیا اور نذیر ناجی ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ نذیر ناجی پہلے مولانا کوثر نیازی کے ہفت روزہ شہاب کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔(٧)

1973 میں مساوات کراچی سے شائع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ شوکت صدیقی کراچی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ خالد علیگ نیوز ایڈیٹر بنے۔ چین سے واپس آنے والے صحافی احفاظ الرحمٰن میگزین ایڈیٹر اور بنگلہ دیش سے آنے والے شہزاد منظر اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ شوکت

صدیقی کو 1974 میں کراچی، لاہور اور لائل پور ایڈیشنوں کا چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ شوکت صدیقی 1976 میں روزنامہ مساوات سے مستعفی ہوئے مگر 1980 تک مساوات میں کالم لکھتے رہے۔ بنگلہ دیش سے آئے ہوئے سینئر صحافی ایس جی ایم بدرالدین کو روزنامہ مساوات کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا اور سینئر صحافی ابراہیم جلیس کراچی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ روزنامہ مساوات نے پیپلز پارٹی کی پہلی حکومت میں تعلیم، صحت، زرعی اصلاحات، پیپلز ورکس پروگرام، بینکوں اور صنعتوں کو قومیانے کی پالیسیوں کے حق میں بھرپور تحریک چلائی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اقتدار میں آتے ہی 22 خاندانوں میں سے چند افراد کو سرمایہ بیرون ملک منتقل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا۔ 60 کے عشرے کے آخری برسوں میں معروف ماہرِ معاشیات ڈاکٹر محبوب الحق نے ایک تحقیقی رپورٹ میں انکشاف کیا تھا کہ ملک کی بیشتر دولت پر 22 خاندان قابض ہیں۔ روزنامہ مساوات نے یکم جنوری 1972 کو یہ سرخی لگائی ''داؤد اور فخر الدین ولیکا کو چھ، چھ ماہ کے لیے گھروں میں نظر بند کر دیا گیا''۔ روزنامہ مساوات نے اپنی رپورٹوں میں عوام کو ان اصلاحات کے فوائد سے آگاہ کیا اور بتایا گیا کہ سرمایہ دار افراطِ زر پیدا کر کے بحران پیدا کر رہے ہیں۔ اسی طرح جب زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں تو ''دیہہ خدا'' کے عنوان سے جاگیرداروں کے شجرۂ نصب پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ دیہاتوں میں بے زمین مزارعوں، کسانوں اور شہروں میں کچلے ہوئے طبقات یعنی تانگہ، رکشہ ڈرائیور، خوانچہ فروش، خاکروب، گندگی سے اشیاء چننے والے اور کچی بستیوں کے مکینوں کے بارے میں ایڈیشن شائع کیے گئے جن کی تصاویر کے نیچے ''سب دھندے پیٹ کی خاطر'' جیسے کیپشن لکھے گئے۔ مساوات نے خواتین کا علیحدہ صفحہ شائع کیا اور خواتین کے مساوی حقوق کی حمایت کی۔ ''آنچل اور پرچم'' کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا جس میں نچلے اور درمیانے طبقے کی خواتین کی امور خانہ داری سے لے کر سیاسی سرگرمیوں تک کو شائع کیا جاتا تھا۔ (۸)

پیپلز پارٹی کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر مبشر حسن کی نگرانی میں سیاسی کارکنوں کی تربیت کے لیے علیحدہ ایڈیشن شائع کیا گیا جن میں ممتاز صحافی حسین نقی نے طلبہ تحریک کے بارے میں جامع آرٹیکل تحریر کیا۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے سماجی تبدیلی سے متعلق آرٹیکل بھی اس میں شائع ہوئے۔ دیگر

صحافیوں نے بھی نظریاتی نوعیت کے آرٹیکل لکھے۔(۹)

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مارچ 1977 میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ روزنامہ مساوات نے پیپلز پارٹی کا انتخابی نشان تلوار کو صفحہ اول پر نمایاں طور پر شائع کیا۔ جب دائیں بازو کی 7 سیاسی جماعتوں کے پاکستان قومی اتحاد (PNA) نے عام انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف تحریک شروع کی تو روزنامہ مساوات نے سب سے پہلے یہ تجزیہ کیا کہ قومی اتحاد کی تحریک کے پس پشت امریکی سی آئی اے کا ہاتھ ہے۔(۱۰)

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کے خاتمے کے لیے پی این اے کے رہنماؤں سے مذاکرات کیے۔ حکومت کی ٹیم میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ مذہبی امور کے وزیر مولانا کوثر نیازی اور وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ شامل تھے۔ پی این اے کی ٹیم کے سربراہ مولانا مفتی محمود تھے جبکہ جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد اور پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے نوابزادہ نصر اللہ خان شامل تھے۔ روزنامہ مساوات نے ان مذاکرات کی خبریں تفصیل سے شائع کیں۔ پھر 4 جولائی کو رات گئے حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا۔ پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل ضیاءالحق نے 5 جولائی کو اقتدار پر قبضہ کرلیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، ان کے قریبی ساتھیوں اور پی این اے کی قیادت کو مختصر عرصے کے لیے مری میں نظر بند کردیا گیا۔ پھر جب ذوالفقار علی بھٹو رہا ہوکر لاہور گئے تو لاہور اسٹیشن پر ان کا زبردست استقبال ہوا۔ روزنامہ مساوات نے چیئرپرسن ذوالفقار علی بھٹو کے استقبال کی خبر اور زیڈ اے بھٹو کی تقریر پورے صفحے پر شائع کی۔(۱۱)

پھر مساوات کے خلاف ایک غیر اعلانیہ آپریشن شروع ہوا۔ روزنامہ مساوات کے چیف ایڈیٹر ایس جی ایم بدرالدین کو 20 جولائی 1977 کو لاہور میں گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے ساتھ معروف شاعر ظہیر کاشمیری بھی گرفتار کیے گئے۔ پھر روزنامہ مساوات کو اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کیا گیا۔ 18 نومبر 1977 کو روزنامہ مساوات کے پرنٹر شیخ زید بن سلطان النہیان ٹرسٹ نے روزنامہ مساوات کراچی کو چھاپنے سے انکار کیا، یوں مساوات کراچی کی اشاعت معطل ہوگئی۔ پھر 15 مارچ 1978 کو لاہور کی سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے روزنامہ مساوات کے چیف

ایڈیٹر ایس جی ایم بدرالدین، افسر بکار خاص معروف شاعر ظہیر کاشمیری اور پرنٹر میر جمیل الرحمٰن کو ایک ایک سال قید با مشقت کی سزا دیدی۔ روزنامہ مساوات کے کراچی کے ایڈیٹر ابراہیم جلیس شیخ زید بن سلطان الہنان ٹرسٹ کے اخبار کو شائع نہ کرنے کے فیصلے کی بناء پر سخت دباؤ کا شکار تھے۔ وہ محکمہ اطلاعات شیخ زید ٹرسٹ اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفاتر کے چکر لگاتے ہوئے تھک چلے تھے۔ ان پر دفتر میں دل کا دورہ پڑا۔ ابراہیم جلیس ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ (۱۲)

11 اپریل 1978 کو روزنامہ مساوات کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر عباس اطہر کو سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی لاہور ہائی کورٹ کی سزائے موت کے فیصلے کے خلاف اپیل کی کاپیاں شائع کرنے پر گرفتار کیا گیا۔ پہلے لاہور اور پھر کراچی کے ایڈیشن پر پابندی لگادی گئی۔ صحافیوں کی تنظیم پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے کراچی مساوات پر پابندی کے خلاف تحریک چلائی۔ لاہور کی تحریک میں صحافیوں اور غیر صحافتی عملے نے گرفتاریاں دیں۔ 13 مئی 1978 کا دن پاکستان کی تاریخ کا بدترین دن تھا جب روزنامہ مساوات کی بحالی کے مطالبہ کے لیے گرفتاریاں دینے والے صحافیوں ناصر زیدی، خاور نعیم ہاشمی، اقبال جعفری اور مسعود اللہ خان کو فوجی عدالت نے 9 ماہ قید با مشقت اور کوڑوں کی سزا دی۔ فوجی عدالت کی سزا پر کوٹ لکھ پت جیل میں سہ پہر کے بعد عملدر آمد ہوگیا تھا۔ ناصر زیدی، خاور نعیم ہاشمی اور اقبال جعفری کو کوڑے مارے گئے۔ ناصر زیدی نے کوڑے لگنے کے بعد اسٹریچر پر لیٹنے سے انکار کیا جس پر جیل میں قید صحافیوں اور سیاسی کارکنوں نے ناصر زیدی کی حمایت میں نعرے لگائے جس کی بناء پر جیل حکام کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ اس تحریک کی بناء پر پنجاب کے مارشل لاء حکام نے روزنامہ مساوات پر سے پابندی ختم کردی اور اخبار کو اشاعت کی اجازت دیدی۔ (۱۳)

مگر حکام نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور روزنامہ مشرق کے جن صحافیوں نے روزنامہ مساوات کی تحریک میں گرفتاریاں دی تھیں انہیں ملازمت سے برطرف کردیا۔ پھر مساوات کراچی پر پابندی عائد کردی گئی۔ پی ایف یو جے نے کراچی میں پھر احتجاجی مہم شروع کی۔ اب صحافیوں اور غیر صحافتی عملے کے علاوہ مزدوروں، کسانوں، طلبہ اور خواتین کے نمائندوں نے گرفتاریاں دیں۔ یہ مہم 4 مہینے سے زائد جاری رہی اور

500 کے قریب صحافیوں، غیر صحافتی عملے، طلبہ، مزدوروں، کسانوں اور خواتین کے نمائندوں نے گرفتاریاں دیں۔(۱۴)

روزنامہ مساوات نے پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی نواب قصوری قتل کیس میں گرفتاری سے لے کر ان کی سپریم کورٹ میں اپیل مسترد ہونے تک خبریں تفصیل سے شائع کیں۔ اسی طرح بھٹو صاحب کے حق میں اداریے اور آرٹیکل تحریر کیے گئے۔ مارشل لاء کے جبر کی بناء پر مساوات کے صحافی سخت دباؤ میں تھے۔ پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار مساوات کے دفاتر کی نگرانی کرتے اور ایڈیٹروں اور دیگر صحافیوں کو گرفتار کیا جاتا مگر مساوات کے صحافیوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔(۱۵)

مساوات نے بھٹو کی جان بچانے کے لیے کارکنوں کی گرفتاریوں، راولپنڈی اور لاہور میں ان کی خودسوزی کی کوششوں، خواتین کے مظاہروں اور قرآن خوانی کی تقریبات کو مشکل حالات میں کور کیا۔ پھر 4 اپریل 1978 کو راولپنڈی جیل میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو پھر روزنامہ مساوات نے 1973 کے آئین کی بحالی اور جیلوں میں سیاسی کارکنوں کے ساتھ ناروا سلوک کی خبریں شائع کیں۔(۱۶)

محمد حنیف رامے اخبار کے بانی ایڈیٹر تھے۔ ایس جی ایم بدرالدین 16 اکتوبر 1979 تک ایڈیٹر رہے۔ درمیانی عرصے میں عباس اطہر، نذیر ناجی، صفدر میر، خورشید عالم، کیپٹن ریٹائرڈ انعام اللہ، میر جمیل الرحمٰن، شوکت صدیقی، ارشاد راؤ، ابراہیم جلیس اور خالد علیگ نے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔(۱۷)

ضیاءالحق نے 16 اکتوبر 1978 کو انتخابات غیر معینہ مدت تک ملتوی کرنے، سیاسی جماعتوں پر پابندی لگانے، روزنامہ مساوات اور حزب مخالف کے دیگر اخبارات کو بند کرنے اور اخبارات پر پری سنسر شپ عائد کرنے کا فیصلہ کیا جس کے بعد مساوات بند ہوگیا۔ 1988 میں پیپلز پارٹی کی حکومت اقتدار میں آئی۔ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بنیں تو مساوات پھر بحال ہوا۔ حمید اختر کچھ عرصے کے لیے ایڈیٹر رہے مگر پیپلز پارٹی کی قیادت کی عدم دلچسپی کی بناء پر مساوات کامیاب نہیں ہوسکا۔(۱۸)

شوکت صدیقی روزنامہ مساوات کراچی کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر اختر سن ناز کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں روزنامہ مساوات کے تجربہ کو یوں بیان کیا:

مساوات کی پالیسی کون طے کرتا تھا؟

ہم نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ اخبار کی پالیسی کے لیے آپ ہمیں کوئی گائیڈ لائن دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہ آپ کی صوابدید پر ہے۔ آپ مجھے وقتاً فوقتاً ملتے رہیں۔ ہم اپنی گورنمنٹ کی جو پالیسی ہوگی وہ آپ کو بتاتے رہیں گے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں حکمرانوں کو خود زیادہ معلوم نہیں ہوتا البتہ انہوں نے کبھی ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔ ان کی تقریروں سے ہمیں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان کی پالیسی آج کل کیا جا رہی ہے۔ ہم اسی کو follow کرتے تھے۔ (۱۹)

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ 210

۲۔ ایضاً

۳۔ اسلم گورداس پوری، ذاتی انٹرویو، لاہور، 25 اپریل 2017

۴۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، صفحہ 215

۵۔ ایضاً

۶۔ رشید بٹ، بانی رکن روزنامہ مساوات، لاہور، ذاتی انٹرویو، 6 جون 2017

۷۔ شفقت تنویر مرزا، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ مساوات، ذاتی انٹرویو، 2017

۸۔ رشید بٹ، بانی رکن روزنامہ مساوات، لاہور، ذاتی انٹرویو، 6 جون 2017

۹۔ نثار حسین، شوکت صدیقی افکار و شخصیت، کتاب پبلکیشنز، صفحہ 27

۱۰۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، صفحہ 216

۱۱۔ سرور جاوید، سینئر شپ ایڈیٹر، روزنامہ مساوات، کراچی، ذاتی انٹرویو، 6 جون 2017

۱۲۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، صفحہ 211

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ توصیف احمد خان، ڈاکٹر، آزادیٔ صحافت میں اخباری تنظیموں کا کردار، صفحہ ....

۱۵۔ ناصر زیدی۔۔، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس، ذاتی انٹرویو، 25 اپریل 2017

۱۶۔ سوینیئر، پی ایف یو جے، مصنف مظہر عباس

۱۷۔ احسان سنگرامی، سینئر فوٹو گرافر، روزنامہ مساوات، مقیم ٹورنٹو کینیڈا، انٹرویو بذریعہ ای میل، 6 جون 2017

۱۸۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، صفحہ 217

۱۹۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، ترقی پسند صحافت، مکالمات، صفحہ 94-93

روزنامہ آزاد

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے صحافیوں اور غیر صحافتی عملے کے حالات کار کو بہتر بنانے کے لیے طویل جدوجہد کی۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں ویج بورڈ ایوارڈ نافذ ہوئے اور صحافیوں کو نئے پے اسکیل کے مطابق اُجرتیں ملیں۔ 1969 میں پی ایف یو جے نے دوسرے ویج بورڈ کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اس وقت کے بورڈ کے چیئرمین نے ویج بورڈ کو قانونی تحفظ نہ ملنے پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ ویج بورڈ کے لیے چیئرمین جسٹس عبدالسلام مقرر ہوئے۔ ویج بورڈ نے ماہر ڈاکٹر اے آر خان کی مدد سے اپنی رپورٹ تیار کی تھی۔ اے آر خان نے مالکان کی فراہم کردہ دستاویزات کی مدد سے ایک قابل عمل فارمولہ تیار کیا جس کی بنیاد پر 7 جنوری 1970 کو ویج بورڈ کے چیئرمین نے عبوری امداد کا اعلان کیا تھا۔ (۱)

پی ایف یو جے نے چار نکات پر مشتمل چارٹر آف ڈیمانڈ پیش کیا۔ اس چارٹر میں خبررساں ایجنسیوں، ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (APP)، پاکستان پریس انٹرنیشنل کی پرانی کیٹیگری بحال کرنے، صحافیوں کو دی جانے والی عبوری امداد کا دائرہ دیگر کارکنوں تک بڑھانے اور صحافیوں کے علاوہ غیر صحافتی عملے کو بھی ویج بورڈ دینے کے مطالبات شامل تھے۔ (۲)

اے پی این ایس نے ہائی کورٹ میں رٹ داخل کی مگر ہائی کورٹ نے اے پی این ایس کی رٹ کو مسترد کر دیا۔ (۳)

12، 13، اور 14 اپریل 1970 کو پی ایف یو جے کی سنٹرل ایگزیکٹو کونسل (CEC)، ایکشن کمیٹی اور اے پی این ایس کے عہدیداروں کے مذاکرات ہوئے مگر اے پی این ایس کے عہدیداروں نے مذاکرات سے واک آؤٹ کیا اور یہ تکنیکی نکتہ اٹھایا کہ پی ایف یو جے ہر اخباری ادارے سے علیحدہ علیحدہ مذاکرات کرے۔ اس وقت کے وزیر اطلاعات جنرل ریٹائرڈ شیر علی خان نے اے پی این ایس کی حمایت کی۔ (۴)

پی ایف یو جے نے ہڑتال شروع کی اور یہ 15 سے 25 اپریل تک جاری رہی۔ سوائے لاہور کے دو اخبارات نوائے وقت اور مشرق کے کوئی اور اخبار شائع نہ ہوا۔ ہڑتال کے خاتمے پر مختلف اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں سے 250 کے قریب صحافیوں اور دیگر کارکنوں کو برطرف کیا گیا۔ برطرف ہونے والوں میں پاکستان ٹائمز کے آئی اے رحمٰن، روزنامہ امروز لاہور کے عبداللہ ملک، حمید اختر اور عباس اطہر بھی شامل تھے۔(۵)

عبداللہ ملک، حمید اختر اور آئی اے رحمٰن نے ایک روزنامہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ عبداللہ ملک اور حمید اختر کا تعلق اردو صحافت سے تھا اور آئی اے رحمٰن نے ساری زندگی انگریزی صحافت میں گزاری تھی مگر 1970 میں سیاسی صورتحال خاصی کشیدہ تھی۔ پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق، جاگیرداری کے خاتمے، صنعتوں اور مالیاتی اداروں کو قومیانے اور صوبائی خودمختاری اور امریکہ کے اثرات کو کم کرنے کے نکات کی بنیاد پر انتخابی مہم چلا رہی تھیں۔ ان جماعتوں کا ایک اہم نکتہ سوشلزم کا نفاذ تھا۔ جماعت اسلامی اور دیگر مذہبی جماعتیں سوشلزم کے خلاف تحریک چلا رہی تھیں۔ روزنامہ آزاد کو شائع کرنے کا مقصد بائیں بازو کی تحریک کو مستحکم کرنا تھا۔ پھر اخبارات سے ترقی پسند صحافیوں کی برطرفی سے جو خلاء پیدا ہوا اس کو پُر کرنا تھا۔(٦)

اخبار کی اشاعت کے لیے جرنلسٹ یونائیٹڈ کے نام سے کمپنی قائم کی گئی اور اخبار کے حصص فروخت کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ ایک حصص کی قیمت 10 روپے مقرر کی گئی۔ عبداللہ ملک نے لکھا ہے کہ پیپلز پارٹی کے رہنما مولانا کوثر نیازی اور ان کے ہفت روزہ شہاب نے روزنامہ آزاد کے اجراء میں مدد کی۔ حمید اختر نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ جرنلسٹ یونائیٹڈ لمیٹڈ کمپنی کے سربراہ مولانا کوثر نیازی تھے۔ فیض احمد فیض نے 10 ہزار روپے دیئے۔ آئی اے رحمٰن نے پاکستان ٹائمز سے ملنے والا پراویڈنٹ فنڈ اخبار میں لگا دیا۔ مولانا کوثر نیازی نے 5 ہزار روپے کے حصص خریدے۔ جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا مفتی محمود اور ان کے سیکریٹری جنرل مولانا عبیداللہ انور نے مالی مدد کی۔ انسانی حقوق کے اولین وکیل اور پیپلز پارٹی کے رہنما محمود علی قصوری کے صاحبزادے عمرِ محمود قصوری نے سب سے زیادہ رقم فراہم کی۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز نے

اپنی کتاب ترقی پسند صحافت میں عبداللہ ملک کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس زمانے میں روزنامہ آزاد سب سے کم سرمایہ سے نکالا جانے والا اخبار تھا۔ اس اخبار کا کوئی روایتی مالک نہیں تھا۔(۷)

روزنامہ آزاد نے اردو صحافت میں ایک نیا میک اپ رائج کیا۔ اس میک اپ میں شہہ سرخی کے ساتھ اس کی Visual پیشکش کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اخبار کی پیشانی لوح کی حیثیت ثانوی تھی۔ لوح کی جگہ روزانہ لے آؤٹ کے حوالے سے تبدیلی ہو جاتی تھی۔ اس میک اپ میں آزاد کے چیف آرٹ ایڈیٹر عزیز اختر مرحوم کے فن اور ذہانت کا یقینی طور پر عمل دخل تھا۔ اس میک اپ میں الفاظ تصویر میں سے ریورس یا اسکرین کے ساتھ مل جل کر زیادہ نمایاں ہو جاتے تھے۔(۸)

آزاد کی پالیسی کے بارے میں عبداللہ ملک لکھتے ہیں کہ آزاد کی ایک اہم خصوصیت اس کی آگ لگا دینے والی سرخیاں تھیں۔ عباس اطہر کے اندر کا صحافی پہلی بار نکل کر سامنے آ گیا۔ انہوں نے پوری آزادی اور قوت کے ساتھ اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ کسی ایک بیان یا تقریر سے جو ردعمل اس کے دل پر ہوتا وہ اس کا برملا اظہار کرتا تھا۔ عباس کو اس امر کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ مقرر نے کیا یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ نہیں۔ 22 دسمبر 1970 کو جب انتخاب کی گرد ابھی نہیں بیٹھی تھی یہ آٹھ کالمی سرخی لگائی:

''ہم مشرقی پاکستان کی غلامی قبول نہیں کریں گے۔''

پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور میں انتخابات کے بعد عوامی لیگ سے سمجھوتہ نہ ہونے پر زبردست تقریر کی۔ عباس اطہر نے بھٹو صاحب کی تقریر کی یہ سرخی لگائی:

''اُدھر تم اِدھر ہم''۔

پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے اس کی وضاحت کی کہ بھٹو صاحب نے یہ الفاظ استعمال نہیں کیے تھے مگر یہ سرخی تاریخ کا حصہ بن گئی۔(۹)

تصویری صحافت: روزنامہ آزاد اپنی تحریروں اور کھلے سیاسی مزاج کے علاوہ اپنی تصاویر کے انتخاب اور اس کے ڈسپلے کے حوالے سے بھی ہم عصر اخبارات سے علیحدہ نظر آتا تھا۔ 70 کی دہائی میں پاکستان میں رنگین طباعت خاصی ترقی کر چکی تھی مگر اس پر لاگت زیادہ آتی تھی۔ آزاد کی

انتظامیہ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ رنگین پرنٹنگ سے استفادہ کر سکے۔ اس کی کمی نئے انداز کے میک اپ میں جدت پیدا کر کے پوری کی گئی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی جلسوں سے خطاب کی جہازی سائز تصاویر سے ایک طرف اخبار کی اشاعت میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف پیپلز پارٹی نے اخبار کو اپنے پروپیگنڈہ ے لیے استعمال کیا۔ عبداللہ ملک اور حمید اختر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اور پھر پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے فعال رکن رہے تھے۔ آئی اے رحمٰن نوجوانی سے بائیں بازو کی تحریک میں شامل تھے۔ اس بناء پر آزاد بائیں بازو کا اخبار تھا مگر بائیں بازو کی تحریک پروچین اور پروسوویت یونین میں تقسیم تھی۔ پروچین سیاسی جماعتوں میں نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی) اور پیپلز پارٹی نمایاں تھیں۔ دیگر پروچین گروہ ٹریڈ یونین، کسان تنظیموں اور طلبہ انجمنوں میں کام کرتے تھے۔ پروسوویت یونین سیاسی جماعت نیشنل عوامی پارٹی ولی خان گروپ تھا۔ عوامی لیگ قوم پرست جماعت تھی۔ روزنامہ آزاد نے کوشش کی کہ بائیں بازو کے جھگڑوں میں ملوث نہ ہو۔ آزاد نے سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی، سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان) اور جمعیت علمائے اسلام اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی حمایت کی۔ سینئر صحافی اور روزنامہ آزاد کے اسسٹنٹ انچارج رشید بٹ کا کہنا ہے کہ آزاد کے سینئر ایڈیٹر عبداللہ ملک عوامی لیگ کے قریب تھے۔ سینئر نیوز ایڈیٹر عباس اطہر پیپلز پارٹی کے حامی تھی مگر عبداللہ ملک، عباس اطہر، آئی اے رحمٰن اور حمید اختر اپنے اپنے تجزیوں میں آزاد تھے۔ جب 1970 میں مشرقی پاکستان میں سمندری طوفان آیا تو ہزاروں افراد ہلاک ہوگئے۔ پاکستان کی سول وفوجی انتظامیہ نے امدادی کاموں پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ امریکی فوجی دستوں نے سمندر پار سے آکر امدادی کام کیا۔ عبداللہ ملک مشکل سفر کر کے ڈھاکہ گئے اور طوفان سے متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا۔ انہوں نے اپنی رپورٹوں میں آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جس کو پڑھ کر مغربی پاکستان کے عوام کو صورتحال کا انداز ہوا۔ رشید بٹ کا کہنا ہے کہ عبداللہ ملک کی پہلی خبر بہت دیر میں نیوز روم پہنچی اور اخبار صبح 4 بجے پریس میں گیا۔ عباس اطہر نے خبر پر سرخی لگائی: ''ہر طرف لاشیں ہی لاشیں''۔ رشید بٹ کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان کے طوفان کی خبر سے اخبار کی اشاعت بڑھ گئی تھی۔ روزنامہ آزاد کو شائع کرنے والا پریس

پرانا تھا۔ جب انتظامیہ کو اندازہ ہوا کہ یہ پریس ہاکروں کے آرڈر کو پورا نہیں کر سکے گا تو روزنامہ آزاد سے متصل روزنامہ نوائے وقت کا دفتر تھا تو ان سے درخواست کی گئی کہ روزنامہ آزاد کو ان کے پریس میں چھاپا جائے۔ بقول رشید بٹ دوسرے دن 12 بجے تک اخبار دونوں پریس میں چھپتا رہا۔ رشید بٹ کا کہنا ہے کہ اخبار میں عبداللہ ملک، حمید اختر اور آئی اے رحمٰن کے تجزیہ کو صفحہ اول پر شائع کیا گیا تھا۔ عبداللہ ملک عوامی لیگ کی حمایت کرتے تھے۔ حمید اختر اور آئی اے رحمٰن کے زیادہ تر تجزیئے سندھ اور پنجاب کے انتخابات سے متعلق ہوتے تھے۔ رشید بٹ کا کہنا ہے کہ ترقی پسند جماعتوں کی خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ دائیں بازو کی مذہبی جماعتوں پر تنقید کی جاتی تھی۔ روزنامہ آزاد نے جنرل یحییٰ خان کے وزیر اطلاعات نوابزادہ شیر علی خان پر کڑی تنقید کی جو مذہبی جماعتوں کے حامی تھے۔ اسی طرح جماعت اسلامی اکثر تنقید کا نشانہ بنتی رہتی۔ روزنامہ آزاد کے رپورٹر باخبر اخبار نویس تھے اس لیے اخبار میں ایکسکلوزو (Exclusive) خبریں ہوتی تھیں۔(۱۰)

روزنامہ آزاد کی اولین اشاعت کے صفحہ اول پر حبیب جالب کی نظم ''روٹی، کپڑا اور دوا، گھر رہنے کو چھوٹا سا'' شائع کی گئی جس سے عوام کے سامنے ''آزاد'' کی پالیسی کا آشکار ہوگئی۔ روزنامہ آزاد نے ایک سیکولر پالیسی اختیار کی۔ بابا گرونانک کے یوم پیدائش پر تعارفی مضمون شائع ہوا تا کہ نوجوانوں کو دیگر مذاہب کی اچھی خصوصیات کا علم ہو سکے۔ اسی طرح خواتین کی مساوی حیثیت کے بارے میں مضامین شائع ہوئے جن میں سوشلسٹ ممالک چین، کوریا، ویتنام اور سوویت یونین وغیرہ میں خواتین کے کردار کو اُجاگر کیا گیا۔ اسی طرح اخبار نے معاشی تفریق اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو خبروں، مضامین، اداریوں اور فیچرز میں پیش کیا۔ اس طرح اخبار میں سامراج مخالف خبروں کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ آزاد نے اپنی خبروں، مضامین اور اداریوں میں زرعی مسائل پر بحث کرتے ہوئے محنت کش طبقوں کی حمایت کی۔ آزاد کی پالیسی کی ایک اہم خصوصیت صوبائی خودمختاری اور قومیتوں کے حقوق کی حمایت تھی۔ یہ مغربی پاکستان کا واحد اخبار تھا جس نے کھل کر شیخ مجیب الرحمٰن کے 6 نکات کی حمایت کی۔ اخبار کے اداریوں اور مضامین میں ون یونٹ کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا۔ بنگالی زبان کو قومی زبان قرار دینے کی تحریک اور اس

تحریک کو کچلنے کے لیے ریاستی مشینری کے استعمال کو عیاں کیا گیا۔ ڈھاکہ میں شہیدوں کی یادگاروں پر پھول چڑھانے کی تصاویر شائع کی گئیں۔ روزنامہ آزاد میں خواتین کا صفحہ ہر روز شائع ہوتا تھا۔ اس صفحے کی انچارج نیّر عباسی تھیں جو اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران بائیں بازو کی واحد منتخب عہدیدار تھیں۔ عورتوں سے متعلق مضامین میں طبقاتی کشمکش اور خواتین کی سرگرمیاں نمایاں ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں دیگر اخبارات میں بیگمات کا ذکر ہوتا تھا جو آزاد کے صفحات پر موجود نہیں ہوتا تھا۔(۱۱)

روزنامہ آزاد میں لکھنے والوں میں عبداللہ ملک، آئی اے رحمٰن، مہدی حسن اور حمید اختر کے مضامین باقاعدہ شائع ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ مظہر علی خان، فیض احمد فیض، مولانا غلام رسول مہر، اے ٹی چوہدری، ظفراللہ پوشنی، شاہد محمود ندیم، نثار عثمانی اور سبط حسن کی تحریریں شامل ہوتی تھیں۔ ابراہیم جلیس اپنے کالم کے ساتھ موجود ہوتے تھے۔ منیر نیازی کے کالم ان کی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ منیر نیازی کے ایک کالم کی سرخی یہ تھی ''تمہاری تحریر کو میں نے آنکھوں سے سنا''۔(۱۲)

روزنامہ آزاد کے سینئر رکن آئی اے رحمٰن روزنامہ آزاد کے اثرات کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> 1959 میں ان اخبارات پر مارشل لاء حکومت کے قبضے کے بعد چار آدمیوں مظہر علی خان، سید افتخار احمد چیف رپورٹر پاکستان ٹائمز، احمد ندیم قاسمی اور سید سبط حسن نے استعفیٰ دیا۔ باقی سب پہلے کی طرح وابستہ رہے۔ یہ کوئی اجتماعی فیصلہ نہیں تھا لیکن ہمارا خیال یہی تھا کہ ترقی پسند صحافی کے لیے یہ ضروری تو نہیں کہ وہ صرف ہم خیال مالکوں کے ساتھ ہی کام کرے۔ دوسری یہ خواہش اور امید کہ مارشل لاء جلد یا بدیر ضرور ختم ہوگا۔ اس لیے اخبارات کو غیر ترقی پسند عناصر کے لیے کھلا میدان نہ بنایا جائے اور حالات کے مطابق حتیٰ الوسع اپنے خیالات کے مطابق صحافت کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حوالے سے ترقی پسند صحافی کامیاب رہے کہ پاکستان ٹائمز اور روزنامہ ''امروز'' پر بنیادی فکری

چھاپ انہی کی رہی تاہم پراپیگنڈہ قابض گروہ کا رہا۔ وہ عہد سیاست کا تھا۔ ہم بہت کم سرمائے سے بڑے بڑے اخبارات کے مقابلے میں آئے تھے۔ ہمارے اندر اپنی بات کو کھل کر کہنے کا جذبہ تھا۔ روزنامہ آزاد کی جو ظاہری شکل تھی اس میں بڑا ہاتھ عباس اطہر کا تھا۔ اخبار تو بہت پاپولر ہوا۔ اس کی عمر کم تھی اس لیے دیرپا اثرات نہیں ہو سکتے تھے تاہم اس نے اپنے معاصرین پر گہرا اثر چھوڑا۔ ان کا رجحان تبدیل ہوا۔ مئی 1970 میں شروع ہوا اور نومبر 1971 میں بند ہو گیا اس لیے کہ مشرقی پاکستان میں لڑائی نے سارے ملک کا کاروبار بند کر دیا تھا۔ ہمارے ذرائع آمدن بند ہو گئے۔ اشتہارات تھے لیکن واجبات نہیں ملتے تھے۔ (۱۳)

جب 1970 کے انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو واضح ہو گیا کہ عوامی لیگ مشرقی پاکستان سے قطعی اکثریت حاصل کر کے قومی اسمبلی کی سب سے بڑی جماعت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ سندھ اور پنجاب سے پیپلز پارٹی، سرحد اور بلوچستان سے نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ) اور جمعیت علمائے اسلام کامیاب ہوئی ہیں۔ روزنامہ آزاد نے اکثریتی جماعت عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنے کی بھرپور حمایت کی۔ روزنامہ آزاد نے گرچہ کہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کی بھرپور حمایت کی تھی مگر جمہوری اصولوں اور ملک کو متحد رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اقتدار عوامی لیگ کو منتقل کیا جائے۔ روزنامہ آزاد کے اس اصولی مؤقف کی بناء پر مغربی پاکستان میں اس کی مقبولیت کم ہو گئی۔ جب جنرل یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع کیا تو روزنامہ آزاد واحد اخبار تھا جس نے اس آپریشن کی مخالفت کی اور بار بار لکھا کہ اس پالیسی کے نتیجے میں ملک ٹوٹ جائے گا۔ اس صورتحال میں روزنامہ آزاد کا مالی خسارہ بڑھ گیا، اشتہارات کی ادائیگی رک گئی، نیوز پرنٹ کی قیمتیں بڑھ گئیں اور مارکیٹ سے نیوز پرنٹ غائب ہو گیا۔ روزنامہ آزاد کے سینئر رکن حمید اختر نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ جولائی کے بعد سوویت یونین کے سفیر لاہور آئے اور عبداللہ ملک، حمید اختر اور آئی اے رحمٰن نے ان سے ملاقات کی۔ سوویت یونین کے سفیر نے اس ملاقات میں واضح کیا کہ مشرقی پاکستان میں حالات سنگین ہو گئے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم اندرا

گاندھی اب اس معاملہ کے حل کے لیے بے چین ہیں اور وہ کسی وقت مشرقی پاکستان پر حملے کے لیے فیصلہ کریں گی۔ اگلے چند ماہ میں صورتحال کی سنگینی کا اندازہ لگاتے ہوئے عبداللہ ملک، حمید اختر اور آئی اے رحمٰن نے محسوس کیا کہ اگر بھارت اور پاکستان میں جنگ ہوگئی تو جماعت اسلامی اور دیگر جنونی عناصر اخبار پر حملہ کر دیں گے، یوں ستمبر 1971 میں اخبار کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔(۱۴)

حوالہ جات

1. Pakistan Federal Union of Journalists, The Long Struglgle Sovenier, Published by Mazhar Abbas, Page No. 43

2. Pakistan Federal Union of Journalists, The Long Struglgle Sovenier, Published by Mazhar Abbas, Page No. 43

3. Pakistan Federal Union of Journalists, The Long Struglgle Sovenier, Published by Mazhar Abbas, Page No. 43

4. Pakistan Federal Union of Journalists, The Long Struglgle Sovenier, Published by Mazhar Abbas, Page No. 43

5. Pakistan Federal Union of Journalists, The Long Struglgle Sovenier, Published by Mazhar Abbas, Page No. 43

۶۔ آئی اے رحمٰن، ذاتی انٹرویو، 12 اپریل 2017، لاہور

۷۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، صفحہ 206

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ رشید بٹ، شفٹ انچارج، روزنامہ آزاد، ذاتی انٹرویو، 3 جون 2017

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، صفحہ 207

۱۳۔ آئی اے رحمٰن، ذاتی انٹرویو، 25 اپریل 2017، لاہور

۱۴۔ حمید اختر، ذاتی انٹرویو، 2 جنوری 2017، ڈیفنس لاہور

ہفت روزہ الفتح

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی 1970 کی ہڑتال کے بعد نیشنل پریس ٹرسٹ اور دیگر اخبارات سے 200 کے قریب صحافی نکال دیئے گئے۔ ان نکالے جانے والے صحافیوں میں روزنامہ مشرق کے ارشاد راؤ، روزنامہ جنگ کے وھاب صدیقی اور اخبار جہاں کے ایڈیٹر محمود شام بھی شامل تھے۔ ارشاد راؤ نے ایک ہفت روزہ رسالہ کی اشاعت کا خیال پیش کیا۔ ایک سینئر صحافی نے اس ہفت روزہ رسالہ کا نام الفتح تجویز کیا۔ رسالہ کے ایڈیٹر اور پبلشر ارشاد راؤ تھے۔ اس ہفت روزہ رسالہ کے نگراں اعلیٰ احمد ندیم قاسمی اور شوکت صدیقی تھے جبکہ مجلس ادارت میں ابراہیم جلیس، محمود شام اور وہاب صدیقی وغیرہ شامل تھے۔ ہفت روزہ الفتح کے لے آؤٹ اور میک اپ کی ذمہ داری انور سمیع کے سپرد تھی۔ نعیم آروی، اشرف شاد، فاروق پراچہ، منہاج برنا، حسین نقی اور شوکت صدیقی لکھنے والوں میں شامل تھے۔ پیپلز پارٹی کے رہنما ڈاکٹر مبشر حسن کے آرٹیکل الفتح میں مختلف اوقات میں شائع ہوئے۔ فلم ڈائریکٹر ضیاء سرحدی نے اپنی یادداشتیں تحریر کیں۔ روزنامہ جنگ سے نکالے جانے والے سینئر صحافی افضل صدیقی نے بھی اپنی کچھ یادداشتیں تحریر کیں۔ اسلم سہراب لاہور سے ڈائری لکھتے تھے۔ احفاظ الرحمٰن چین کے دارالحکومت بیجنگ سے ہر ہفتے اپنا کالم لکھتے تھے۔ پھر احسان عظیم سندھ کے نمائندے مقرر ہوئے۔ ناصر زیدی ملتان اور ماجد یاسر عرفات کے نام سے کوئٹہ سے ڈائری لکھتے تھے۔ ایک اور نوجوان صحافی الطاف صدیقی نے کوئٹہ سے برنا بلوچ کے قلمی نام سے ڈائری تحریر کی۔ (۱)

الفتح کے ایڈیٹر وہاب صدیقی کہتے ہیں کہ الفتح صحافیوں کے چندے سے شائع ہونا شروع ہوا۔ فاروق پراچہ نے چار یا پانچ ہزار روپے فراہم کئے۔ روزنامہ ڈان کے اس وقت کے نیوز ایڈیٹر ایم بے زاہدی نے 200 روپے، احمد علی خان نے 100 روپے اور شاعر محسن بھوپالی نے 150 روپے دیئے تھے۔ کراچی کے طاہر نیوز ایجنسی کے مالک طاہر علی نے الفتح کی مالی طور پر

بہت مدد کی۔ طاہر علی ہر ہفتے الفتح کی کاپیاں ملتے ہی فوری طور پر رقم ادا کر دیا کرتے تھے۔ الفتح کی پالیسی بنیادی طور پر جمہوریت کی بحالی، فوجی اقتدار کے خاتمے اور سوشلزم کے پرچار کو اولیت دیتی تھی۔ الفتح میں طلبہ تنظیموں کی سرگرمیوں، ملک کی جامعات کی صورتحال، مزدور کسان تنظیموں کی جدوجہد اور پیپلز پارٹی کی انتخابی سرگرمیوں کو اہمیت دی جاتی تھی اور یہ تاثر تھا کہ الفتح کے لوگ پیپلز پارٹی کے چیئر پرسن ذوالفقار علی بھٹو کے قریب تھے۔ الفتح کے بنیادی موضوعات میں ملک کے سیاسی حالات پر رپورٹیں اور تجزیے، سیاسی رہنماؤں کے انٹرویو، بین الاقوامی حالات کا جائزہ اور خاص طور پر ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں چلنے والی انقلابی تحریکوں کے بارے میں رپورٹیں شائع کی جاتی تھیں۔ 70 کی دھائی میں ویتنام میں کیمونسٹ پارٹی ہوچی منہ کی قیادت میں امریکہ کی استعماری پالیسی کے خلاف تاریخی جدوجہد کر رہی تھی۔ جنوبی افریقہ میں افریقن نیشنل کانگریس کی اور دیگر افریقی ممالک میں سیاہ فام اکثریت کی جدوجہد کی رپورٹیں شائع کی جاتی تھیں۔ اسی طرح جدید چین کے بانی ماؤزے تنگ کے لانگ مارچ پر تفصیلی فیچر الفتح میں شائع ہوتے تھے۔ پھر پاکستان میں طلبہ تحریک، مزدوروں کی عالمی تحریک، خاص طور پر مزدوروں کے عالمی دن یوم مئی کے پس منظر اور اس تحریک کے نتائج پر الفتح میں خصوصی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ الفتح میں پاکستان کے مختلف شہروں کی سیاسی ڈائریاں خاصی مشہور تھیں۔ الفتح کا ایک اور سلسلہ مختلف اداروں میں ہونے والی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرنا تھا۔ 1973 میں وہاب صدیقی الفتح کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور سابق مزدور رہنما واحد بشیر اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے الفتح کے ادارتی بورڈ کا حصہ بن گئے۔

(۲)

1970 میں الفتح میں ہیوی مکینیکل کمپلیکس واہ سے اسلحہ چوری کی رپورٹ شائع ہوئی۔ مکینیکل کمپلیکس کے سربراہ میجر جنرل راؤ فرمان علی تھے۔ انہوں نے لاہور کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل ٹکا خان سے الفتح میں شائع ہونے والے آرٹیکل کی شکایت کی۔ میجر جنرل ٹکا خان نے احمد ندیم قاسمی کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور ان سے الفتح میں شائع ہونے والی رپورٹ کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ قاسمی صاحب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر سے گھر واپس آئے تو انہوں نے الفتح کے ایڈیٹر سے کہا کہ ان کا نام نگران کی حیثیت سے ہٹا دیا جائے، یوں احمد ندیم

قاسمی کا نام حذف ہوگیا۔ شوکت صدیقی جنرل ضیاء الحق کے دور تک نگران اعلیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو الفتح کے ایڈیٹر اور پبلشر نے شوکت صدیقی کا نام نگران کی حیثیت سے حذف کرنے کا فیصلہ کیا۔ (۳)

سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین میں اختلافات کے بعد بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک تقسیم ہوئی۔ پاکستان میں بھی 60 کی دہائی میں کمیونسٹ پارٹی پہلے دو اور پھر زیادہ حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ کمیونسٹ پارٹی پرو چائنا گروپ کی قیادت پی آئی اے کی ایئر ویز ایمپلائز یونین کے سربراہ طفیل عباس نے سنبھال لی۔ الفتح کے ایک نگران شوکت صدیقی، ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ، منہاج برنا، وہاب صدیقی، محمود شام اور نعیم آروی وغیرہ کمیونسٹ پارٹی پرو چائنا گروپ سے منسلک تھے۔ پھر اس کمیونسٹ پارٹی نے پیپلز پارٹی کی مکمل حمایت کی۔ سابق طالب علم رہنما معراج محمد خان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے معراج محمد خان کو اپنا جانشیں قرار دیا، یوں الفتح نے پیپلز پارٹی کی بھرپور حمایت کی اور پیپلز پارٹی میں معراج محمد خان اور بائیں بازو کے دیگر رہنماؤں کو بھرپور کوریج دی گئی۔ الفتح کے بارے میں یہ تاثر عام ہوا کہ یہ ہفت روزہ پیپلز پارٹی میں شامل بائیں بازو کے گروپ کا ترجمان ہے۔ الفتح کے ایڈیٹر وھاب صدیقی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ کمیونسٹ پارٹی کا ایک فرنٹ ڈاکٹر رشید حسن خان کی قیادت میں کام کرنے والا نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور دوسرا پی آئی اے ایئر ویز ایمپلائز یونین پر مشتمل تھا۔ الفتح ان دونوں فرنٹ کی ہر ممکن حمایت کرتا تھا۔ (۴)

الفتح کے 1970 سے شائع ہونے والے شماروں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کراچی یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی میں ہونے والے طلبہ یونینوں کے انتخابات میں اسلامی جمعیت طلبہ کے تھنڈر اسکواڈ کی ان یونیورسٹیوں میں بائیں بازو کے طلبہ پر تشدد کے واقعات کی تفصیلی رپورٹنگ الفتح میں ہوتی تھی۔ پھر 1970 کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی سرگرمیوں کو مکمل طور پر کور کیا گیا۔ الفتح میں پیپلز پارٹی کے بعد نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ کے بارے میں بھی تفصیلی خبریں شائع کی گئیں۔ نیشنل عوامی پارٹی نے پنجاب کے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تاریخی کسان کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے لاکھوں افراد شریک ہوئے جس

میں نیپ کے علاوہ پیپلز پارٹی، بائیں بازو کی دیگر جماعتوں، مزدور اور طلبہ تنظیموں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ الفتح میں اس کانفرنس کے انعقاد سے بہت پہلے رپورٹیں شائع ہونا شروع ہوئیں۔ الفتح نے کانفرنس کی کامیابی کے لیے ماحول کی تیاری میں اہم کردار ادا کیا۔(۵)

جب پیپلز پارٹی 20 دسمبر 1971 کو اقتدار میں آئی اور چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے تو الفتح کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ الفتح نے پیپلز پارٹی کی حکومت کے ناقد کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ سینئر صحافی محمود شام نے پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ وقت آ گیا ہے کہ حکومت اور پارٹی کے عہدے علیحدہ علیحدہ ہونے چاہئیں۔ الفتح کے ایڈیٹر وہاب صدیقی کا کہنا ہے کہ اس آرٹیکل کی اشاعت پر پیپلز پارٹی کی حکومت نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ وہاب کہتے ہیں کہ جدید جمہوری نظاموں کے استحکام میں سیاسی جماعتوں کے کردار کے تناظر میں یہ آرٹیکل تحریر کیا گیا تھا مگر ناقدین نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ اس آرٹیکل کا مطلب پیپلز پارٹی میں بائیں بازو کے رہنما معراج محمد خان کو پیپلز پارٹی کا چیئرمین بنوانا ہے۔ جون 1972 میں کراچی کے صنعتی علاقے سندھ انڈسٹریل ایریا (SITE) کے مزدوروں نے تنخواہوں کی ادائیگی اور حالات کار کو بہتر بنانے کے لیے متحدہ مزدور فیڈریشن کے رہنماؤں عثمان بلوچ اور واحد بشیر کی قیادت میں تاریخی جدوجہد کی۔ اس وقت سندھ کے وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو تھے۔ سندھ حکومت نے پولیس فورس کا استعمال کیا۔ پولیس کی فائرنگ سے کئی مزدور جاں بحق ہوئے۔ سائٹ کا علاقہ کئی دن تک بند رہا اور مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ سندھ حکومت نے پہلی دفعہ وفاق کے زیر اہتمام قائم ہونے والی فیڈرل سیکیورٹی فورس کو بھی استعمال کیا۔ الفتح نے اس تحریک کو مکمل طور پر کور کیا۔ الفتح کے سرورق پر ہلاک ہونے والے مزدوروں کی تصاویر شائع کی گئیں۔ الفتح میں شائع ہونے والی رپورٹوں میں تحریک کے آغاز کی وجوہات بیان کی گئیں، خاص طور پر پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کے بعد صنعت کاروں کی مزدور دشمن پالیسیوں کو واضح کیا گیا۔ اس تحریک کے حوالے سے انقلابی شاعر نقاش کاظمی کی نظم جلی حرفوں سے شائع کی گئی۔(۶)

پیپلز پارٹی کی وفاقی اور صوبائی حکومتیں الفتح میں مزدور تحریکوں کے بارے میں کوریج پر

ناراض ہوگئیں۔حکومت نے الفتح کا نیوز پرنٹ کا کوٹہ منسوخ کردیا اور سرکاری اشتہارات پر پابندی لگادی۔ جب حکومت سندھ نے سندھی کو صوبہ سندھ کی سرکاری زبان بنانے کا بل صوبائی اسمبلی سے منظور کرایا تو سندھ اسمبلی میں موجود دائیں بازو کی جماعتوں جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان نے اس بل کو اردو اور اسلام کے خلاف سازش قرار دیا۔ روز نامہ جنگ نے اپنے پہلے صفحے پر رئیس امروہوی کی ایک نظم ''اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' جلی حرفوں سے شائع کی جس پر کراچی اور اندرون سندھ لسانی فسادات شروع ہوگئے۔ سندھی زبان کے بل کے خلاف تحریک چلانے والوں میں کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور تحریک استقلال کے رہنما ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، محمود الحق عثمانی، رئیس امروہوی، محسن بھوپالی، شاہ فرید الحق، پروفیسر غفور احمد اور شاہ احمد نورانی نمایاں تھے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اُردو اور سندھی بولنے والے دانشوروں کو اسلام آباد میں مدعو کیا اور ایک معاہدہ ہوا۔ الفتح نے اس سارے تنازعے میں سندھی کو سندھ کی سرکاری زبان قرار دینے کے فیصلے کی بھرپور حمایت کی۔ الفتح نے اس دوران اپنے اداریوں میں سندھی زبان کے خلاف تحریک چلانے والے رہنماؤں کے خفیہ مفادات کو واضح کیا اور بار بار یہ مؤقف پیش کیا کہ سندھی زبان ایک تاریخی زبان ہے، اس زبان کو اس کا حق ملنا چاہیے اور سندھی زبان کو صوبہ کی سرکاری زبان قرار دینے سے اُردو کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُردو ملک کی قومی زبان ہے۔ اردو کے رسالے کا سندھی زبان کی حمایت ایک تاریخی واقعہ تھا۔ اس لسانی جھگڑے میں سیاسی جماعتوں کے علاوہ اخبارات ورسائل بھی تقسیم ہوگئے تھے مگر الفتح کا ایک منفرد مؤقف سامنے آیا۔ الفتح نے پیپلز پارٹی کی حکومت کی بنیادی اصلاحات خاص طور پر تعلیمی اداروں، بینکوں، صنعتی اداروں کو قومیانے، جاگیرداری کے خاتمے اور زرعی اصلاحات کی بھرپور حمایت کی۔ الفتح نے اپنی اشاعت کے وقت سے نجی تعلیمی اداروں کی لوٹ کھسوٹ، تنخواہوں کے لیے اساتذہ کی جدوجہد، طلبہ کی فیسوں میں کمی اور تعلیمی اداروں میں سہولتوں کی فراہمی، صنعتی اداروں میں مزدوروں کے بدترین حالات اور ملک کی دولت 22 خاندانوں تک محدود ہونے کے حوالے سے رپورٹیں اور تجزیے شائع کیے تھے۔ اسی طرح قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں کے کسانوں پر مظالم، سندھ میں ہاری، پنجاب میں کسان تنظیموں اور سرحد میں ہشت نگر میں کسانوں اور

بلوچستان کے کسانوں کی ششک کے خلاف جدوجہد کی رپورٹیں اور تجزیے مستقل شائع ہوتے تھے۔ اس تناظر میں بھٹو حکومت کی ان اصلاحات کا تجزیہ نگاروں نے معروضی انداز میں تجزیہ کیا اور ان اصلاحات کی خامیوں اور خوبیوں کو بھرپور انداز میں اُجاگر کیا۔ (۷)

جب پیپلز پارٹی کے بانی رکن معراج محمد خان وفاقی وزارت سے مستعفی ہوئے اور پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دیا تو الفتح نے معراج محمد خان کی پیپلز پارٹی سے علیحدگی کو پیپلز پارٹی اور حکومت کے لیے بہت بڑا نقصان قرار دیا۔ الفتح نے پیپلز پارٹی میں جاگیرداروں کے شامل ہونے اور انہیں حکومتی عہدے دینے کی پالیسی کی اپنے اداریوں اور رپورٹوں میں مخالفت کی۔ جب پنجاب میں پیپلز پارٹی کے بانی رکن حنیف رامے کو وزیراعلیٰ کے منصب سے ہٹایا گیا اور پیپلز پارٹی کے ابتدائی مخالف صادق حسین قریشی کو پنجاب کا وزیراعلیٰ بنایا گیا تو الفتح نے اس تبدیلی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ پیپلز پارٹی جاگیرداروں کو عہدے دے کر اپنی بنیادی پالیسی سے گریز کر رہی ہے جس کا مستقبل میں سخت نقصان ہوگا۔ الفتح کی یہ رپورٹ مستقبل میں درست ثابت ہوئی۔ 5 جولائی 1977 کو جب جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹا تو نواب صادق حسین قریشی پیپلز پارٹی سے علیحدہ ہو گئے۔ الفتح کے ایڈیٹر وہاب صدیقی اپنی یادداشتوں کی بنیاد پر بتاتے ہیں کہ اس وقت پیپلز پارٹی کے مخالف پیر علی محمد راشدی اور یوسف ہارون پیپلز پارٹی کی حکومت کے مشیر بن گئے۔ پیر علی محمد راشدی نے الفتح کے خلاف ایک اداریہ تحریر کیا اور یہ اداریہ پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار روزنامہ مساوات میں اشاعت کے لیے بھیجا گیا۔ الفتح کے نگران شوکت صدیقی مساوات کراچی کے ایڈیٹر تھے۔ صدیقی صاحب نے وہاب صدیقی کو اپنے دفتر بلایا اداریہ وہاب صدیقی کو دیا اور اُن سے پوچھا کہ کیا اداریہ مساوات میں شائع ہونا چاہیے؟ وہاب صدیقی نے شوکت صدیقی کو مشورہ دیا کہ وہ اداریہ شائع کریں، یوں روزنامہ مساوات میں ہفت روزہ الفتح کے خلاف اداریہ شائع ہوا۔ (۸)

پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں پیپلز پارٹی کے رہنما حیات محمد خان شیر پاؤ پشاور یونیورسٹی میں بم دھماکے میں جاں بحق ہوئے۔ اسلام آباد میں عراقی سفارتخانے سے اسلحہ برآمد ہوا۔ بھٹو حکومت نے بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت کو برطرف

کر دیا۔ نیپ کے رہنما گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو اور سرحد کے گورنر ارباب خلیل اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔ حکومت نے نیپ کی قیادت کو گرفتار کرلیا۔ اس دوران معراج محمد خانؔ کو کراچی میں اسکولوں کے اساتذہ کے مظاہرے میں شرکت اور ان کی حمایت کرنے پر پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا تھا۔ پیپلز پارٹی کے ایک اور رہنما علی احمد تالپور اور دیگر کو نیپ کے رہنماؤں کے ساتھ سازش کیس میں ملوث کیا گیا۔ ان رہنماؤں کے خلاف حیدرآباد جیل میں خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ مقدمہ حیدرآباد سازش کیس کے نام سے مشہور ہوا۔ الفتح اس ملک کا واحد رسالہ تھا جس نے اس مقدمے کی دستاویزات کو شائع کیا اور اپنے اداریوں میں مقدمے میں ملوث کرنے کے مضمرات پر رپورٹیں شائع کیں۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مارچ 1977 میں قبل از وقت انتخابات کا اعلان کیا۔ اب پیپلز پارٹی کی قیادت نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں کے چناؤ کا معاملہ بیوروکریسی اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سپرد کر دیا۔ اس کمیٹی میں پیر علی محمد راشدی جیسے لوگ شامل تھے۔ الفتح نے اس صورتحال کو پیپلز پارٹی کے لیے خطرناک قرار دیا۔ الفتح کا تجزیہ تھا کہ پیپلز پارٹی اور چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور عوام میں فاصلے بڑھ رہے ہیں جس کا فائدہ رجعت پسندوں اور فوج کو ہوگا۔ مستقبل میں الفتح کا یہ تجزیہ بھی درست ثابت ہوا۔(۹)

انتخابات کے اعلان کے بعد نادیدہ قوتوں کے ایماء پر پاکستان قومی اتحاد (PNA) قائم ہوا اور پی این اے نے جارحانہ مہم شروع کر دی۔ سرمایہ داروں نے پی این اے کو بڑے پیمانے پر فنڈ فراہم کئے۔ پھر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ پی این اے نے انتخابی دھاندلیوں کے الزامات لگائے۔ کراچی، لاہور اور ملتان احتجاجی تحریک کا مرکز بن گئے۔ پی این اے نے پہیہ جام ہڑتال کی کال دی تو حکومت نے پولیس کے ذریعے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی۔ حکومت نے پی این اے کے رہنماؤں کو گرفتار کیا۔ پھر وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور پی این اے کے رہنماؤں کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے۔ الفتح کے نامہ نگاروں نے پی این اے کی تحریک پر رپورٹیں اور تجزیے بھیجے۔ ان رپورٹوں میں فوج اور عسکری خفیہ ایجنسی انٹر سروسز انٹیلی جنس ایجنسی (ISI) کے ملوث ہونے کے بارے میں واضح اشارے دیئے گئے۔ پھر 4 جولائی

1977 کی رات کو پیپلز پارٹی کی حکومت اور پی این اے کے رہنماؤں کے درمیان نئے انتخابات کے انعقاد کے بارے میں معاہدہ ہوا مگر 5 جولائی کی رات کے آغاز کے ساتھ ہی فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے راولپنڈی میں تعینات 111 برگیڈ کو وزیراعظم ہاؤس پر قبضے اور وزیراعظم کے ساتھی وزراء کی گرفتاری کا حکم دیا۔ فوج نے پی این اے کے رہنماؤں کو حفاظتی تحویل میں لے لیا۔ 5 جولائی 1977 سے بدترین فوجی آمریت کا دور شروع ہوا۔ الفتح نے اپنے اداریے میں فوج کے اقتدار سنبھالنے کو 1973 کے آئین کی خلاف ورزی قرار دیا، یوں الفتح کا سخت مشکلات سے بھرپور دور شروع ہوا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا 1970 سے الفتح میں لکھا کرتے تھے۔ اب انہوں نے اپنا کالم شروع کیا۔ برنا اپنے کالم میں بھٹو حکومت کی پالیسیوں خاص طور پر آزادیٔ اظہار رائے، آزادیٔ صحافت اور سیاسی آزادیوں پر پابندیوں، مزدوروں اور کسانوں کی صورتحال پر روشنی ڈالتے تھے۔ انہوں نے اپنے کالموں میں جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت پر تنقید جاری رکھی۔ جنرل ضیاء الحق کے دور کے آغاز پر سینئر صحافی محمود شام کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر الطاف حسن قریشی چند دنوں کے لیے گرفتار ہوئے۔ فوجی حکومت نے سیاسی کارکنوں کو گرفتار کرنا شروع کیا اور پھر روزنامہ مساوات پر پابندیاں عائد کیں۔ منہاج برنا نے اپنے الفتح کے اس کالم کے ذریعے رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی جس پر الفتح کو پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کے تحت ضمانت جاری کرانے کے نوٹس جاری کیے گئے اور پاکستان ٹائمز انتظامیہ نے منہاج برنا کو 3 ستمبر 1977 کو ہفت روزہ الفتح میں آرٹیکل لکھنے پر برطرف کر دیا۔ بعد میں پی ایف یو جے کی جدوجہد کے نتیجے میں برنا صاحب ملازمت پر بحال ہوئے۔ (۱۰)

حکومت سندھ نے پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس 1963 کے تحت قابل اعتراض مواد کی اشاعت پر 30 ہزار روپے بطور ضمانت طلب کیے۔ پھر حکومت سندھ نے کالونی ٹیکسٹائل ملز میں مزدوروں پر فائرنگ سے متعلق ناصر زیدی کی رپورٹ کو پی پی او کی دفعات کی خلاف ورزی قرار دیا۔ پھر حکومت سندھ کے سیکریٹری داخلہ نے پی پی او کی متعلقہ دفعات کے تحت الفتح کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا۔ الفتح کے ایڈیٹر وہاب صدیقی اور پبلشر ارشاد راؤ نے اس فیصلے کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ الفتح کا ڈیکلریشن منسوخ ہونے کے بعد الفتح شائع کرنے والے ادارے

نے سات ہفت روزہ، ایک پندرہ روزہ اور ایک ماہنامہ رسالہ کے صفحہ اول پر الفتح کی لوح کو شائع کیا۔ان رسالوں میں ہفت روزہ ریاست کراچی، ہفت روزہ راہی حیدرآباد، ہفت روزہ انقلاب راولپنڈی، ہفت روزہ پرھات نواب شاہ، ہفت روزہ فریاد کندھ کوٹ، پندرہ روزہ شبنم، ہفت روزہ ذوالفقار گھوٹکی، ماہنامہ لوح وقلم کراچی، ماہنامہ آواز کراچی اور ہفت روزہ البرق جیکب آباد شامل تھے مگر حکومت نے ان تمام رسالوں کے ڈیکلریشن منسوخ کر دیئے۔

جب فوج نے مارچ 1971 میں مشرقی بنگال میں فوجی آپریشن شروع کیا تو عوامی لیگ کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین روپوش ہوگئے۔ کچھ نے سرحد پار کر کے کلکتہ میں قائم ہونے والی عوامی لیگ کی جلاوطن حکومت میں شمولیت اختیار کر لی تو حکومت نے ضمنی انتخابات کا اعلان کیا اور کچھ رہنما بلا مقابلہ منتخب ہوگئے۔الفتح نے 4 تا 11 نومبر 1971 کے اداریہ میں لکھا:

''مشرقی پاکستان کے ضمنی انتخابات میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں کی اکثریت کی بلا مقابلہ جیت نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی ساکھ کو مزید نقصان پہنچایا ہے۔اس سے پارلیمانی انتخابات کے بارے میں بہت سے لوگوں کی خوش فہمیاں دور ہوگئی ہیں۔ مغربی جمہوریت کا وہ تصور بھی ختم ہوگیا ہے جس کے ذریعے سرمایہ داری نظام، جاگیردارانہ قیادت اور نوکر شاہی کو مسلّط رکھنے کے لیے عوام کی شرکت کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے جس میں مظلوم اور بھوکے ننگے عوام اپنے نمائندوں کے طور پر بڑے جاگیرداروں، بڑے کارخانے داروں اور ان کے مفادات کے نگہبانوں کو منتخب کرتے ہیں۔وقتی طور پر امیدوار ہر جگہ عوام عوام کی رٹ لگاتے ہیں، ان کی مجبوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور جیتنے کے بعد عوام کو ہی تختۂ مشق بناتے ہیں۔مشرقی پاکستان کے ضمنی انتخابات میں جو کچھ ہوا ہے یا ہوگا، وہ پارلیمانی انتخابات ضرور ہیں لیکن ان میں عوام کو شریک نہیں کیا گیا۔عوام نے بلا مقابلہ منتخب ہونے والوں کے نام ریڈیو پر سن لیے ہیں۔ان میں وہ بھی شامل ہیں جو ان انتخابات کے دوران اپنے حلقۂ انتخاب تک نہیں گئے بلکہ بیرونی ممالک، ڈھاکہ اور اسلام آباد کے درمیان سفر کرتے رہے ہیں۔ان میں سرفہرست پاکستان جمہوری پارٹی کے محمود علی ہیں جو بلا مقابلہ منتخب ہوگئے ہیں۔انہوں نے نیویارک جانے سے پہلے اعتراف کیا کہ وہ اپنے انتخابی حلقے میں نہیں جا سکے۔ بلا مقابلہ منتخب ہونے والے افراد کا

انتخاب کس نے کیا ہے؟ یہ کوئی بہت بڑا معمہ نہیں۔ وہ طاقت یا طاقتیں صاف نظر آ رہی ہیں جو ملک کی اکثریتی آبادی کے اس صوبے کے سیاہ وسفید کی مالک بنی بیٹھی ہیں۔"(۱۱)

الفتح میں "عہد نامہ 1971 " کے عنوان سے شائع ہونے والے اداریہ میں الفتح کی مظلوم عوام کی ترجمانی کے عزم کی تجدید کی گئی:

"ہم عہد کرتے ہیں کہ: مظلوم عوام کی ترجمانی کا فرض ادا کرتے رہیں گے۔ نوکرشاہی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کا پردہ چاک کرتے رہیں گے۔ مقبوضہ صحافت کے اس تاریک دور میں اگرچہ ہمارا راستہ کٹھن، دشوار اور خاردار ہے، صحافت پر بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا تسلط ہے اور عوام کی ترجمانی بالواسطہ سب سے بڑا جرم بن چکی ہے مگر فرض کی پکار کا تقاضا پورا کرنا ہے۔ ہم یہ راستہ بخوشی قبول کرتے ہیں اور منزل تک پہنچنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہم حمایت کرتے رہیں گے ان تمام افراد کی جو مزدور کسان راج کے لیے گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہمارا یہ پختہ ایمان ہے کہ حکمرانی کا منصب عوام کو زیب دیتا ہے۔ وطن عزیز کے بارہ کروڑ عوام کی آبادی مزدور اور کسان طبقے پر مشتمل ہے، وہی اس کے حاکم ہیں۔ ہم ان کی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، نوکرشاہی اور ان کے غیرملکی آقاؤں کے خلاف جدوجہد میں برابر کے شریک رہیں گے۔ آزاد صحافت کا علم بلند رکھیں گے۔ مزدور، کسان اور طلبہ سے گہرا رشتہ ہی اس پرچم کو جلا بخش سکتا ہے۔ اس کے لیے ہم اس قول پر عمل کرتے رہیں گے "تمام علم وادب کا سرچشمہ عوام ہیں"۔ پاک چین دوستی کو مزید مضبوط بنائیں گے۔ آج چین ہی دنیا بھر کے مظلوم عوام کا واحد ایسا دوست ہے جو ان کے سب سے بڑے دشمن امریکی سامراج کے خلاف برسرپیکار ہے اور دنیا بھر کے عوام کی مسلح جدوجہدِ آزادی کی عملی حمایت کرتا ہے۔ آج ہم سلام پیش کرتے ہیں ان جیالوں کو جنھوں نے آزادئ صحافت کے لیے مقبوضہ اخبارات کے وڈیروں کے خلاف علم بغاوت

بلند کیا، اس کے لیے مشکلات برداشت کیں اور معاشی بدحالی کا مردانہ وار مقابلہ کرر ہے ہیں۔ ان شہیدوں کو جنہوں نے وطن عزیز کی دھرتی پر امریکی سامراج، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے مظالم سہے اور شہید ہو گئے ۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور مر گئے ۔ ان دلیروں کو جو آج بھی ملک سے امریکی سامراج کو مار بھگانے میں مصروف ہیں اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے بند پڑے ہیں اور جنہوں نے مزدور کسان راج کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں ۔ ہم ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کے نقوش ہمارے لیے مشعل راہ ہیں ۔'' (۱۲)

ذوالفقار علی بھٹو 19 دسمبر 1971 کو برسر اقتدار آئے ۔ ان کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ الفتح کا دوسرا اداریہ شائع ہوا۔ یہ اداریہ حکمرانوں کو پسند نہیں آیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بھٹو کو قیادت سے علیحدہ کر کے معراج محمد خان کو پارٹی کا قائد بنانے کی سازش ہے ۔

''مسٹر بھٹو نے اقتدار سنبھال لیا ہے ۔ یہ عمل انتہائی غیر معمولی اور نازک ترین حالات میں مکمل ہوا ہے ۔ گوناگوں بحرانوں کے دوران اُبھرنے والی مسٹر بھٹو کی شخصیت کو یہ منصب پاکستان کی تاریخ کے عظیم ترین بحران میں ملا ہے ۔ ایک کڑی آزمائش ان کے روبرو کھڑی ہے ۔ چاروں طرف مسائل ہی مسائل ہیں ۔ مشرقی پاکستان پکار رہا ہے ۔ بڑی طاقتیں منہ پھاڑے لپک رہی ہیں اور اندرون ملک سب کچھ دیوالیہ ہو چکا ہے ۔ مسٹر بھٹو نے اس ذمہ داری کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ وہ آزمائش سے نمٹنے کے لیے پورے زور سے مصروف عمل ہو گئے ہیں ۔ قوم کو سب سے پہلے فوجی وڈیروں سے نجات دلانے کے لیے بعض اہم اقدامات کیے ہیں ۔ 16 اکتوبر 1951 سے 21 دسمبر 1971 تک بیس سال سے زائد ملکی سیاست میں کھلم کھلا شریک ان جنرلوں کی برطرفی کوئی معمولی واقعہ نہیں ۔ وہ جنرل جنہیں عوام اپنا محافظ سمجھتے رہے اور جنہوں

نے عوام کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، آج چھانٹی اور جبری برطرفیوں کا سامنا کرر ہے ہیں۔نئی حکومت نے 22 خاندانوں کو بھی پابند کردیا ہے۔ یہ خاندان سیاہ وسفید کے مالک رہے ہیں۔ان کے پاسپورٹ ضبط کرنے کے احکامات نے عوام کو تاثر دیا ہے کہ وہ محاسبے سے بالاتر نہیں، شاید انہیں شکنجے میں ہی جکڑ دیا جائے یا پھر یہ خاندان پہلے کی طرح اپنی نجات کا راستہ تلاش کرلیں۔اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ اتنا ضروری ہے کہ تمام وڈیروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کی اجارہ داریاں ہی ختم کر کے ملک کو اندرونی استحکام نصیب ہوسکتا ہے۔مسٹر بھٹو نے بحیثیت صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مختلف ذمہ داریوں سے عہدہ براء ہونے کے لیے جن شخصیات پر اعتماد کیا ہے ان کی ذمہ داریاں بھی صدر مملکت سے کم نہیں۔ ذرہ برابر غلطی، خودغرضی، اقرباء پروری اور غیر دانشمندانہ اقدامات کے نتائج بہت بُرے ہونگے۔ان میں سے گورنر ہوں یا وزیر، مشیر ہوں یا کوئی اور سب کو ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اور ان کی تمام کوششیں ملک کے کروڑوں مظلوم عوام اور وطن کے استحکام کے لیے ہیں۔ان کا محاسبہ ضروری اور انتہائی توجہ کا مستحق ہے۔ یہ ذمہ داری صرف اور صرف پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن ہی انجام دے سکتے ہیں۔ مسٹر بھٹو کو آج جس قدر مضبوط اور منظّم پیپلز پارٹی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ فوری طور پر اس خلاء کو پُر کیا جائے۔صدر مملکت خود اس جماعت کے بنیادی عہدے پر فائز ہیں، جن گورنروں اور وزیروں کو حکومت میں شامل کیا گیا وہ بھی پارٹی کے سیکریٹری جنرل سے لے کر دیگر صوبائی اور شہری قیادت کے عہدوں پر مامور ہیں۔ کارکنوں کو ان حالات میں اپنی قیادت سے گہرا رابطہ رکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیپلز پارٹی کے یہ کارکن جن کی اکثریت مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے مسٹر جے۔اے۔ رحیم، شیخ رشید یا دیگر عہدیداروں سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اسلام آباد نہیں جاسکتی، وہ مقامی مسائل کو فوری

طور پر پارٹی کی پالیسیوں کی روشنی میں حل کرنے کے لیے بے چین ہے۔"(۱۳)

15-22 جون 1972 کو الفتح کے اداریہ بعنوان "ظلم۔ یحیٰ اور ایوب سے سوا" میں لکھا گیا:

"آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ پولیس فائرنگ نے عوامی حکومت کی قلعی کھول دی ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا مطالبہ کرنے والوں کے سینے ایوب اور یحیٰ خان نے چھلنی ضرور کیے تھے، ظلم ہوا اور خوب ہوا۔ عوام نے اس سے نفرت کی اور بھرپور کی، اس کے نتیجے میں صدر بھٹو برسر اقتدار آئے۔ عوام کی آنکھیں کھل گئی ہیں کہ گولی اب بھی چلتی ہے۔ اس میں پہلے سے زیادہ شدت ہے۔ ایوب اور یحیٰ خان نے اتنی بے رحمی نہ کی تھی جتنا ریکارڈ عوامی حکومت قائم کر رہی ہے۔ صدر بھٹو نے اسے سازش کا نام دیا ہے۔ عظیم مزدور رہنما عثمان بلوچ نے بھی اسے سازش قرار دیا ہے اور الفتح اس سازش کی نشاندہی پچھلے ہفتے کر چکا ہے۔ صدر بھٹو جس سازش کی نشاندہی کر رہے ہیں وہ بادی النظر میں موجود نہیں۔ ان کے وزراء کی نااہل کھیپ نے نوکر شاہی کی رپورٹوں اور اپنے شرمناک انسانیت سوز اور بہیمانہ سلوک پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ تاثر دیا ہے کہ مزدوروں میں بے چینی پیدا کی گئی ہے تاکہ بھارت کا پلہ بھاری رہے، پاکستان ختم ہو جائے اور اکھنڈ بھارت بن جائے۔ یہ غلط ہے، جھوٹ ہے، بہتان ہے اور بکواس ہے۔ صدر کو یہ رپورٹ پہنچانے والے ملک کے بدترین دشمن ہیں۔ یہ وہ شہزادے ہیں جو گوہر ایوب کو مات دے رہے ہیں۔ یہ وہ نوکر شاہی ہے جو سرمایہ داروں کی پالتو ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں ایوب خان اور یحیٰ خان نے بھی کہا تھا کہ میرے خلاف مضبوط مرکز کے خلاف مزدوروں اور کسانوں کی حمایت میں جدوجہد کرنے والے بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ یہ غلط نہیں، جھوٹ نہیں، یہ بہتان نہیں تو ثبوت فراہم کیے جائیں کہ یہ بیرونی سازش

ہے۔ بیرونی ایجنٹوں کو کھلے عام پھانسی دیجئے ورنہ عوام سے معافی مانگیے کہ ان کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار تک پہنچنے والوں کو ایسے غیر ذمہ دارانہ بے بنیاد الزامات لگانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ عظیم مزدور رہنما جناب عثمان بلوچ نے کہا ہے کہ یہ سازش تھی۔ بالکل درست کہا ہے۔ اس کے ثبوت موجود ہیں۔ کھلی عدالت میں مقدمات چلائے جائیں۔ دیکھیں پھر یہ سازش کیسے ثابت نہیں ہوتی۔ یہ مزدوروں، کسانوں اور مظلوم طبقات کو منظم نہ ہونے دینے کی سازش ہے۔ اس کا ایک مرحلہ پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔'' (۱۴)

ہفت روزہ الفتح نے 13 تا 20 جنوری 1978 کی اشاعت میں کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے مزدوروں پر پولیس اور انتظامیہ کی فائرنگ کے خلاف اداریہ تحریر کیا جس پر حکومت نے الفتح کو اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کیا اور ضمانت طلب کی۔ بعد میں الفتح کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا گیا۔ اداریہ درج ذیل ہے:

''جنوری 1953 اور جنوری 1978 کے درمیان پچیس برسوں کا فاصلہ ہے لیکن ثابت یہ ہوا ہے کہ یہ فاصلہ صرف شب و روز کے شمار کا فاصلہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے محنت کش عوام جس ظلم و جبر کا شکار پچیس سال پہلے تھے آج بھی اسی کا شکار ہیں۔ 8 جنوری 1953 کو کراچی کے طلبہ کے لہو سے ہولی کھیلی گئی تو اس میں ایک رکشہ ڈرائیور، ایک گمنام پٹھان مزدور اور ایک ڈرائی کلینگ کی دکان کے ملازم کا لہو شامل تھا اور 2 جنوری 1978 کو جب کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے مزدوروں کو ان کے اپنے خون میں ڈبویا گیا تو اس میں اسکول کے دو طلبہ کا خون بھی شامل تھا۔ اکثر لوگوں نے ان واقعات کو سانحے اور المیے قرار دیا اور ان کے ذمہ داروں کو قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ ہم اس مطالبے کی حمایت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان خونی واقعات کو سانحے اور المیے کہنا درست نہیں۔ سانحے اور المیے تو اتفاقی ہوتے ہیں، انسانی قبضہ و اختیار سے باہر عوامل یا غلطی سے وقوع پذیر ہوتے

ہیں، طلبہ، مزدوروں، کسانوں اور دیگر محنت کرنے والے لوگوں کے خلاف اس جرم میں طاقت کا استعمال کرنا کہ وہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، نہ اتفاقی امر ہے نہ انسانی اختیار سے باہر عوامل اس کے ذمہ دار ہیں نہ ہی یہ کوئی نادانستہ غلطی ہے۔ ان واقعات کے پیچھے ایک مذموم اور انسانیت دشمن ذہنیت کارفرما ہے جو سامراجی آقا اپنے جانشینوں کے لیے ورثے میں چھوڑ گیا ہے۔ اس ذہنیت کا سدباب گولی چلانے یا گولی چلانے کا حکم دینے والوں کو سزا دینے سے نہیں ہوگا۔ ویسے بھی 1956 کے ڈھاکہ کے قتلِ عام سے لے کر آج تک مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر ہونے والے قتلِ عام میں کبھی کسی کو سزا ہوئی؟ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ واقعات کیوں وجود میں آتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ نجی ملکیت کا موجودہ نظام اور مراعات یافتہ طبقات کی بالادستی کو بزور قائم رکھنے کی سوچی سمجھی حکمت عملی ہے۔ اس حکمت عملی پر عمل درآمد کن اداروں کے توسط سے ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ ملتان کا حالیہ قتلِ عام قومی ضمیر کے لیے ایک ضرب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ذاتی مفاد اور ذاتی منفعت رکھنے والے کوئی ضمیر نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی ایک مشین کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہم ان سے انسان دشمنی کے علاوہ کسی بات کی توقع نہیں رکھتے۔ یہ واقعہ تو ایک سوال بن کر ان کے سامنے کھڑا ہے جو خود ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔" (۱۵)

جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے 1978 میں ہفت روزہ الفتح کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا۔ الفتح مطبوعات کراچی نے ہفت روزہ پربھات نواب شاہ شائع کیا۔ 8 اگست 1978 کو الفتح کے مدیر نے پربھات میں شائع ہونے والے اداریے میں لکھا:

"آج 14 اگست 1978 کا سورج طلوع ہوا ہے۔ برطانوی سامراجی حکومت کے براہِ راست شکنجے سے آزادی کے بتیسویں سال کا پہلا دن۔ آج بھی خبروں کی اشاعت کے معاملے میں اخبارات دو حصوں میں تقسیم ہیں۔

ایک وہ حصہ جو روایتی بلی کی طرح آنکھیں بند کر کے دودھ پیتا ہے اور اس فریب میں مبتلا ہے کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس اور مارشل لاء احکام اور ضوابط کی تمام تر جکڑ بندیوں کے باوجود اپنی استطاعت کے مطابق حقائق و واقعات کو لفظوں اور تصویروں کی شکل میں پیش کر رہا ہے۔ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ موجودہ حکومت سے پہلے کسی نے واضح طور پر چادر اور چار دیواری کی حفاظت کا ایسا حتمی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اسی طرح حقیقت پسندی کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ بات بلا کسی جھجک کے کہی جائے کہ صرف آج کی خبریں پڑھ کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن فخر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں بھی چادر اور چار دیواری کی یوں بے حرمتی نہیں کی گئی تھی۔ اس صورتحال پر صرف نفیس خلیلی کا ایک بہت پرانا شعر دہرایا جا سکتا ہے:

دیکھتا ہے کیا مرے منہ کی طرف
قائد اعظم کا پاکستان دیکھ

31 سالہ ماضی پر نظر ڈالیے تو معمولی ردوبدل کے ساتھ ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ ایسا تسلسل جسے اگر کوئی نام دیا جا سکے تو محاورتاً ''پیغمبری وقت'' ہی کہا جا سکتا ہے۔ آج سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے والے لوگوں پر جیسے یہ ذمہ داری آن پڑی ہے کہ جو لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے دیکھنے سے منکر ہیں انہیں دیکھنے پر مجبور کریں۔ جو لوگ کان رکھتے ہوئے بھی سننے سے عاری ہیں انہیں حرفِ حق سننے پر مجبور کیا جائے اور جو لوگ دماغ سے سوچنے کا کام لینا بھول گئے ہیں انہیں مثبت سوچ کی راہیں دکھائی جائیں۔ ہم اس بات کے مدعی نہیں کہ ہم یہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس لیے کہ قرطاس و قلم اس حد تک پابند ہیں کہ آزادیٔ صحافت کے حصول کے لیے پیٹھیں کوڑوں کے لیے اور ہاتھ پاؤں زنجیروں کے لیے پیش کرنے پڑ رہے ہیں۔ ہم مطمئن نہیں ہیں۔

اس لیے کہ ہم اپنا فرض اپنی تمنا کے مطابق انجام نہیں دے پا رہے۔ لیکن ہم شرمسار بھی نہیں اس لیے کہ ہم کاہلی اور غفلت کا مظاہرہ نہیں کرر ہے ہیں۔ ہم خود کو طاقتور اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ ہماری آواز حق وصداقت کی ہم سفر ہے اور بدترین مخالف بھی ہمارے مطالبات کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ عوامی پسند ناپسند کا دباؤ یقیناً ایسا ہی طاقتور ہے۔ تاریخ کے سفر میں شخصیتیں گردِ سفر ہیں۔ اصول اور اجتماع ہی قائم و دوائم ہیں۔ ضروریات زندگی، ایجاد واختراع اور فن وثقافت کی تخلیق کرنے والے ہاتھ ہی اصل دستِ تاریخ ساز ہیں، انہیں قطع کرنا کسی کے بھی بس کی بات نہیں۔''(۱۶)

حکومت نے اس ہفت روزہ پر بھی پابندی لگادی۔ الفتح کے ڈیکلریشن کی منسوخی اور پھر ہفت روزہ پربھات کے ڈیکلریشن کی منسوخی کے بعد 8 ستمبر 1978 کو ہفت روزہ ذوالفقار گھوٹکی سے شائع کیا جس کا اداریہ تھا:

''کل یوم عید الفطر تھا اور آج یومِ دفاع پاکستان ہے۔ صالحین کو اس بات پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ ہم نے روزِ عیدِ سعید پر مبارک سلامت کے ڈونگرے برسانے کی بجائے یہ طرزِ گفتگو کیوں اختیار کیا؟ لیکن یہ اعتراض صرف ظاہری اور آپ کو دکھلانے کے لیے ہوگا ورنہ وہ اندر سے پھٹ رہے ہونگے کہ انہوں نے عام مسلمانوں کے ایک حلقے کو عید کی خوشیوں سے محروم کر کے کتنی زبردست فتح حاصل کی ہے۔ ان کی یہ خوشی بجا بھی ہوگی کہ اپینک، پی ایف یو جے اور عوامی جدوجہد کمیٹی کی مشترکہ اپیل پر عام مسلمانوں کے ایک حصے نے یومِ عید الطفر کو یومِ احتجاج کے طور پر منایا اور ان کروڑوں لوگوں میں شامل ہوئے جن کے لیے عید پریشانیاں اور دُکھ لے کر آتی ہے۔ جو یا تو قرضوں کے بوجھ تلے دب کر جھوٹی خوشی مناتے ہیں یا پھر ان کے افلاس کے وارث بچوں کو سرد آہوں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے جھوٹی تسلیاں دیتے اور بہلانے کی

کوشش کرتے ہیں۔اخبارات کے عیدایڈیشن میں ''صالحین'' کی سرخیوں میں سے دو مارشل لائی وزیروں کے بیانات زخمی دلوں پر نمک پاشی کرتے نظر آئے۔ جناب محمود اعظم نے ٹی وی کے پروگراموں یعنی رقص کے پروگرام ''پائل'' اور کلاسیکی موسیقی کے پروگرام کے بارے میں زہرافشانی فرمائی۔ یہ کچھ ایسی ہی بات ہوئی کہ پاکٹ یونین کا کوئی عہدیدار اکاؤنٹنٹ محمود اعظم فاروقی کو یہ مشورہ دے کہ کھاتے کس طرح مرتب کیے جائیں، ٹیکس کی اونچی شرحوں سے بچنے کے لیے کیا ہتھکنڈے اختیار کیے جائیں اور منافع کی شرح کو گھٹا کر مزدوروں کو کم سے کم مراعات پر کیسے ٹرخایا جائے۔اس تمام کاروبار کے ماہر جناب محمود اعظم فاروقی اس حقیقت سے واقف ہونگے کہ جمع، تفریق، ضرب، تقسیم اور ان کے ساتھ پہاڑے اس میدان میں اتنے ضروری ہیں کہ ان کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔حتیٰ کہ الجبرا بھی اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔تو جناب کلاسیکی رقص وموسیقی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی جذبات کے خوبصورت اظہار کی ساری صورتیں تشکیل پاتی ہیں لیکن اس بارے میں ہمیں فاروقی صاحب سے کوئی گلہ نہیں اس لیے کہ اگر زندگی، انسانیت، صداقت اور حسن سے بیر نہ رکھتے تو وہ ''صالحین'' کے سرخیل کیسے بنتے؟ یہ تو انہیں کا حصہ ہے کہ طلبہ، مزدوروں اور ہاریوں پر کھلے بندوں اور عقوبت خانوں میں ہونے والے تشدد کو نہ تو ان کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں نہ کان سُن سکتے ہیں اور شاید ان ہی جیسے لوگوں کے لیے بتایا گیا ہے کہ ان کے قلوب پر مہریں لگا دی گئی ہیں۔شاید ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' کا اس سے بہتر مظاہرہ اور کوئی نہ ملے۔ایذا رسانی کا ایک اور طریقہ بھی بطور عیدی مجاہدین صحافت کے حصے میں آیا۔اعلان کیا گیا کہ پچھلے چار ہفتوں میں مظاہرے کے سلسلے میں گرفتار ہونے والوں کو رہا کیا جا رہا ہے۔مگر محمود اعظم فاروقی جیسے حساب داں اور پروفیسر خورشید جیسے ماہرِ اعداد و شمار کی کرشمہ کاری کہ اس مدت میں گرفتار ہونے والے

سو سے زائد مجاہدین صحافت کی تعداد گھٹ کر پچاس رہ گئی اور ان پچاس افراد کو بھی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ایسے وقت میں رہا کیا گیا کہ وہ نمازِ عید سے قبل اپنے گھروں کو نہ پہنچ سکیں اور انتظار اور کوفت کی صورت میں سزا ان کے لواحقین کو بھی دی گئی۔'' (۱۷)

سندھ ہائی کورٹ نے 1980 میں الفتح پر عائد پابندی کو غیر قانونی قرار دیدیا، یوں الفتح پھر شائع ہونے لگا۔ یہ پری سنسر شپ کا دور تھا۔ حکومت سندھ کے محکمہ اطلاعات کے سینئر افسران الفتح کے ہر آرٹیکل سے فوجی حکومت کے خلاف مواد نشر کرنے یا قابل اعتراض آرٹیکل کہہ کر سنسر کر دیتے تھے۔ یکم جنوری 1981 کو پولیس اور خفیہ عسکری ایجنسی کے اہلکاروں نے الفتح پر چھاپا مارا۔ ایڈیٹر وہاب صدیقی، پبلشر ارشاد راؤ، واحد بشیر، نعیم آروی، کاتب ضامن علی اور ایک سیاسی کارکن شرف علی کو گرفتار کرلیا۔ جب الذوالفقار کے کارکنوں نے پی آئی اے کا طیارہ اغواء کیا تو ان کے مطالبے پر الفتح کے ایڈیٹر وہاب صدیقی کو جلاوطن کر کے دمشق بھیج دیا گیا۔ وہاب صدیقی ایک سال تک دمشق کے ایک گھر میں نظر بند رہے، پھر ہالینڈ کی حکومت نے انہیں سیاسی پناہ دیدی۔ الفتح کے پبلشر ارشاد راؤ، واحد بشیر اور ضامن علی کو سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے قید و بند کی سزائیں دیں۔ پھر مظلوم طبقات کی آواز اٹھانے والا الفتح ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔'' (۱۸)

حوالہ جات

۱۔ صدیقی، وہاب، سابق ایڈیٹر الفتح، ذاتی انٹرویو، 16 اگست 2017ء

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً، صفحہ 232

۹۔ اختر (ڈاکٹر)، احسن ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، صفحہ 232

۱۰۔ ہفت روزہ الفتح، 8 دسمبر 1977

۱۱۔ ہفت روزہ الفتح، اداریہ 4 تا 11 نومبر 1971

۱۲۔ ہفت روزہ الفتح، اداریہ، 26 دسمبر 1971

۱۳۔ ہفت روزہ الفتح، اداریہ، 26 دسمبر 1971

۱۴۔ ہفت روزہ الفتح، اداریہ، 15 تا 22 جون 1972

۱۵۔ ہفت روزہ الفتح، اداریہ، 13 تا 20 جنوری 1978

۱۶۔ الفتح مطبوعات ہفت روزہ پربھات، گھوٹکی، اداریہ، 8 اگست 1978

۱۷۔ الفتح مطبوعات ہفت روزہ ذوالفقار، گھوٹکی، اداریہ، 8 ستمبر 1978

۱۸۔ صدیقی، وہاب، سابق ایڈیٹر الفتح، ذاتی انٹرویو، 3 اگست 2017

روزنامہ امن

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی اپریل 1970 کی ہڑتال کے اختتام پر روزنامہ جنگ نے اپنے جن کارکنوں کو برطرف کیا ان میں نیوز ایڈیٹر افضل صدیقی اور ایک سب ایڈیٹر اجمل دہلوی بھی شامل تھے۔ افضل صدیقی ادیب، فنکار اور کہنہ مشق صحافی تھے۔ وہ 60 کی دہائی میں ریڈیو پاکستان کراچی کے مشہور پروگرام ''حامد میاں کے ہاں'' کے کردار انجم میاں کی بناء پر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ افضل صدیقی اور اجمل دہلوی کا تعلق دلی سے تھا۔ ان صحافیوں نے بے روزگاری کے زمانے میں روزنامہ اعلان میں کام کیا۔ افضل صدیقی اداریہ نویسی، کالم اور خبروں کے انتخاب میں مہارت رکھتے تھے۔ اجمل دہلوی بہترین ترجمہ کرنے، خبروں کی ادارت اور خبروں کے صفحات کے لیے لے آؤٹ اور میک اپ کے ماہر جانے جاتے تھے۔(۱)

ان صحافیوں کی کوششوں سے روزنامہ اعلان نے 1971 میں مقبولیت حاصل کی۔ پھر جب 1972 میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے 70 کی ہڑتال کی بناء پر نکالے جانے والے صحافیوں کی بحالی کے لیے اخباری مالکان کو مجبور کیا اور حکومت کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے نیشنل پریس ٹرسٹ نے اپنے صحافیوں کی واپسی کا فیصلہ کیا تو روزنامہ جنگ نے بھی اپنے صحافی واپس لئے مگر افضل صدیقی اور اجمل دہلوی نے اپنی پرانی ملازمتوں پر نہ جانے کا فیصلہ کیا اور 19 مئی 1972 کو کراچی میں آئی آئی چندریگر روڈ کے ایک چھوٹے سے دفتر سے روزنامہ امن کا اجراء ہوا۔ افضل صدیقی روزنامہ امن کے ایڈیٹر بن گئے اور روزنامہ امن اس سلوگن کے ساتھ شائع ہوا ''جنگ سے نفرت امن سے محبت''۔ جرنلسٹس ٹرسٹ کے تحت شائع ہونے والے اخبار کا مزاج عوامی بنایا۔ روزنامہ امن کی ابتدائی ٹیم میں اجمل دہلوی، عبدالوحید خان، معین الحق، ذاکر نسیم، مبشر منصور، طاہر نجمی اور علی احمد خان شامل تھے۔ روزنامہ امن نے سیاسی جماعتوں، مزدور یونینوں اور طلبہ تنظیموں کی خبروں اور ان کی سرگرمیوں کو خصوصی اہمیت دی۔ غریب بستیوں کے مسائل کو اُجاگر کیا

گیا، خراب حالات کار اور سخت موسم میں کام کرنے والے محنت کشوں کے حالات پر فیچر شائع کیے گئے، خاص طور پر کام کرنے والی خواتین اور طلبہ کے مسائل اُجاگر کیے گئے۔(۲)

اجمل دہلوی نے اپنا کالم ''جمعہ خان'' کے نام سے شروع کیا۔ شروع میں اجمل دہلوی کے علاوہ افضل صدیقی اور دیگر صحافیوں نے بھی اس کالم میں طبع آزمائی کی مگر پھر اجمل دہلوی ہی اس کالم کو لکھتے رہے۔ اجمل دہلوی نے اس کالم میں ایک نیا طرزِ تحریر رائج کیا۔ سیاسی مسائل پر مختصر اور تیز جملے تحریر کیے۔ جب جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کیا اور بیشتر اخبارات نے حکومت کی کاسہ لیسی کی پالیسی اختیار کی تو روزنامہ امن حزب اختلاف کی آواز بن گیا۔ اجمل دہلوی نے اپنے کالم میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے تضادات، فوجی حکومت کی مخالف جماعتوں پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کی تنظیموں کے رہنماؤں پر ہونے والے ریاستی جبر کا پردہ چاک کیا۔ جب جنرل ضیاء الحق نے اخبارات پر سنسر لگایا اور بیشتر مخالف اخبارات کو بند کر دیا گیا تو اجمل دہلوی نے اپنے کالم میں ہر ممکن کوشش کی کہ وہ بین السطور عوام کی بات کر سکیں، یوں 80 کی دہائی میں روزنامہ امن میں شائع ہونے والا ''جمعہ خان'' کا کالم ملک میں سب سے مقبول کالم بن گیا۔(۳)

امن جب تک متحدہ قومی موومنٹ کا ترجمان نہیں بنا یہ کالم پورے ملک میں مقبول رہا۔ روزنامہ امن نے سیاسی جماعتوں، طلبہ، مزدور اور کسان تنظیموں کی خبریں مختصر طور پر شائع کرنے کی روایت کو زندہ کیا۔ یہ روایت پہلے روزنامہ جنگ نے قائم کی تھی مگر روزنامہ جنگ کی پالیسی کو کنٹرول کرنے والے مالکان اور ایڈیٹر دائیں بازو کے خیالات کو اہمیت دیتے تھے، اس بناء پر ان جماعتوں کی خبروں کو فوقیت دی گئی مگر روزنامہ امن نے ہر تنظیم کی خبر شائع کی، یوں روزنامہ امن کی اشاعت بڑھ گئی۔ پھر روزنامہ امن نے ہر دور میں حکومتوں کے منحرفین کی خبروں کو خصوصی اہمیت دی۔(۴)

روزنامہ امن میں اس وقت کے قائد حزب اختلاف ولی خان کی ایک معرکتہ الآراء تقریر شہ سرخیوں سے شائع ہوئی جس پر روزنامہ امن کے ایڈیٹر افضل صدیقی کو ڈیفنس آف پاکستان رولز (DPR) کے تحت گرفتار کیا گیا۔ پی ایف یو جے کے احتجاج پر افضل صدیقی کو رہا کیا گیا۔(۵)

اسی طرح روزنامہ امن نے کراچی کی مزدور تحریک کی خبروں کو بھی خصوصی کوریج دی۔

جب جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977 کو مارشل لاء نافذ کیا اور ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو برطرف کردیا گیا اور ذوالفقار علی بھٹو سمیت پیپلز پارٹی کے ہزاروں کارکنوں کو گرفتار کیا گیا اور جب لاہور ہائی کورٹ میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قصوری قتل کیس کا مقدمہ شروع ہوا تو روزنامہ امن نے اس معاملے کو خصوصی کوریج دی۔(٦)

پیپلز پارٹی کے کارکن اندرون سندھ اور پنجاب کے چھوٹے شہروں میں زیادہ فعال تھے۔ اسی طرح بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں، طلبہ، مزدور، کسان اور خواتین کی تنظیموں کے انتخابات کے التواء اور متنازعہ مذہبی قوانین کے خلاف مہم کو شائع کیا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے 1978 میں روزنامہ مساوات پر پابندی کے خلاف کراچی، لاہور اور پھر کراچی میں تحریک چلائی۔ اس تحریک کو حکومتی دباؤ کے باوجود روزنامہ امن نے بھرپور کوریج دی۔ اس تحریک کے دوران روزنامہ امن سے تعلق رکھنے والے متعدد صحافیوں اور کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔ پھر روزنامہ امن کا ایک اور کارنامہ سنسر شپ کے دوران کالعدم قرار دی گئی سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں کو شائع کرنا تھا۔ اس طرح 1980 میں پیپلز پارٹی، تحریک استقلال، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، پاکستان نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، پاکستان نیشنل پارٹی، قومی محاذ آزادی، مزدور کسان پارٹی، مسلم لیگ ملک قاسم گروپ اور عوامی تحریک نے جمہوریت کی بحالی کی تحریک (MRD) قائم کی اور اگست 1983 سے 1973 کے آئین کی بحالی اور عام انتخابات کے انعقاد کے لیے تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے دوران اندرون سندھ فوج نے احتجاج کرنے والے لوگوں پر اندھادھند فائرنگ کی۔ ہزاروں لوگوں نے اس موقع پر گرفتاریاں دیں۔ پنجاب، سرحد، آزاد کشمیر اور بلوچستان میں سیاسی جماعتوں کے کارکنوں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ اس تحریک کی خبریں تفصیل سے روزنامہ امن میں شائع ہوئیں۔ جنرل ضیاء الحق نے اخبارات پر سے سنسر شپ ختم کی مگر روزنامہ امن پر سنسر شپ جاری رہی۔(۷)

1988 میں جب پیپلز پارٹی کی دوسری حکومت محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں قائم ہوئی تو روزنامہ امن نے پیپلز پارٹی اور مہاجر قومی موومنٹ (MQM) کے درمیان اتحاد کرانے

میں اہم کردار ادا کیا۔ مگر پھر روز نامہ امن متحدہ قومی موومنٹ کا ترجمان اخبار بن گیا۔ افضل صدیقی کے انتقال کے بعد اجمل دہلوی روز نامہ امن کے ایڈیٹر بنے۔ ایم کیو ایم نے انہیں سینٹ کا ٹکٹ دیا۔ جب 1992 میں پاکستان کی فوج نے ایم کیو ایم کے خلاف آپریشن کیا تو امن نے آپریشن میں انسانی حقوق کی پامالی کے بارے میں آوازوں کو جگہ دی۔ اس طرح روز نامہ امن کا انسانی حقوق کی پامالی کے مسائل کی کوریج کا امتیاز برقرار رہا۔ روز نامہ امن نے بلدیاتی اداروں کے احیاء اور ان کو بااختیار بنانے کے لیے اداریے تحریر کئے۔ (۸)

روز نامہ امن کے 4 اپریل 1984 کے اداریہ میں کہا گیا:

''آج ایک ایسے عظیم انسان کا یوم شہادت منایا جا رہا ہے جس کو پاکستانی عوام نے پہلی مرتبہ اپنا سربراہ منتخب کیا تھا اور جسے دنیا کے تمام مسلم ملکوں کے سربراہوں نے بھی جن میں صدر، وزیر اعظم اور بادشاہ شامل تھے اپنا پہلا سربراہ منتخب کیا تھا۔

برسوں بعد پاکستان کو ایک ایسا عوامی رہنما ملا تھا جو چاروں صوبوں کے عوام میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ لوگ اس کے اچھے نام کی وجہ سے یا اس کے اچھے چہرے کی وجہ سے اس کے ساتھ پیار نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے اعمال کی وجہ سے اس کو چاہتے تھے۔ کسی دوسرے حکمراں کو اتنی محبت اور عقیدت حاصل نہ ہو سکی جتنی اب تک اس عظیم مدبر کو حاصل ہے۔

بہت سے لوگ حکمراں بنتے ہیں حکمرانی کرنے کے لیے لیکن چیئر مین بھٹو عوام کی خدمت کے لیے میدان میں آئے تھے دن رات عوام کی خدمت کرتے رہے اور ایسے کارنامے انجام دے گئے جو بے مثال ہیں ان ہی کارناموں کی وجہ سے عوام کے دلوں میں ذوالفقار علی بھٹو کی محبت بھی لازوال ہے۔

جب چیئر مین بھٹو نے حکومت سنبھالی تھی تو پاکستان کے ٹوٹ جانے پر پوری قوم صدمے سے نڈھال تھی۔ ڈھاکہ پر بھارتی فوجوں کے قبضے اور وہاں پاکستانی کمانڈروں کے ہتھیار ڈال دینے پر ہماری مسلح افواج کے اعصاب

جواب دے گئے تھے۔ بڑے بیوروکریٹ جو حکمرانوں کو انگلیوں پر نچاتے تھے اپنا منہ چھپائے پھر رہے تھے اور امریکہ کی دلالی کرنے والے ارب پتی خاندانوں پر بھی سکتہ طاری تھا۔"(۹)

روزنامہ امن کے 30 اپریل 1984 کے اداریہ میں کہا گیا:

"پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے سے بہت پہلے کی بات ہے کہ مشرقی پاکستان کے سیاستدان مغربی پاکستان والوں کے سلوک سے غیر مطمئن تھے۔ وہ سب جمہوریت پسند تھے اور انہوں نے قائداعظم کی قیادت میں آئینی جدوجہد کے ذریعہ پاکستان حاصل کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ آئینی اور جمہوری طریقوں سے پاکستان میں امورِ حکومت کو نمٹایا جائے مگر جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت تھی انہوں نے ایک آزاد اور خودمختار مملکت کے شایانِ شان ایسا نظام اختیار کرنے کی فکر نہ کی جو لوگوں کے مزاج اور قوم کے مفاد میں ہوتا۔ وہ انگریزوں کی تعلیم و تربیت سے متاثر تھے۔ چنانچہ انہوں نے فرنگیوں کے قوانین، ضوابط اور روایات کو ہی اپنے گلے کا ہار بنائے رکھا۔ تمام صوبوں کو سول سروس اور فوجی سروس میں مناسب نمائندگی دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، صنعت، تجارت اور زراعت میں بھی اس طبقہ کو نوازا گیا جس کو انگریزوں کے دور میں مراعات ملتی تھیں۔ سیاست میں بھی پرانی اجارہ داریاں بحال رکھی گئیں۔ تمام صوبوں میں متوازن ترقی کا منصوبہ نہیں بنایا جاسکا اور پسماندہ علاقوں کی پسماندگی دور کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ چنانچہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں باشعور لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ پاکستان بننے سے کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوسکی اور سیاسی آزادی کا فیض عوام تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ اس سوچ سے نئی ہلچل پیدا ہوئی جس کو دبانے کے لیے اور سیاسی و اقتصادی استحصال کا عمل جاری رکھنے کے لیے اسلام اور نظریہ پاکستان کے نعرے لگوائے گئے۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ سیاسی مسئلے کو سیاسی طریقہ سے حل کیا جاتا ہے فوجی مسئلہ فوجی

طریقے سے حل ہوتا ہے اور اقتصادی مسئلہ اقتصادی طریقے سے حل کرنا چاہیے لیکن جس کسی نے کوئی مرض بتایا اس کو ہی سمجھایا گیا کہ نظریہ پاکستان کو عزیز رکھو اور صبر و شکر سے کام لو۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ جو حکمران اسلام اور نظریہ پاکستان کا نعرہ لگاتے تھے وہ خود ان نعروں میں مخلص نہیں تھے اور محض اپنے سیاسی و اقتصادی استحصال کو جاری رکھنے کے لیے اسلام کی دہائی دیتے تھے۔ یہ حقائق جیسے جیسے بے نقاب ہوتے گئے لوگوں میں بیزاری بڑھتی چلی گئی۔ اس لیے کہ خالی پیٹ روٹی مانگتا تھا اور نظریہ پاکستان کا نعرہ لگانے سے بھوک نہیں مٹتی تھی۔" (۱۰)

روزنامہ امن کے 5 مئی 1985 کے اداریہ میں کہا گیا:

"مطلق العنان فوجی حکمرانوں کو سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کا بہت شوق ہوتا ہے اور وہ کسی کو زیادہ عرصے تک کسی عہدے پر نہیں رہنے دیتے کہ کہیں کوئی اپنی جڑیں مضبوط نہ کرلے۔ پاکستان میں اگرچہ کاغذ پر مارشل لاء ختم ہو گیا ہے لیکن عملاً اس کے واضح آثار اب بھی موجود ہیں اور جنرل ضیاء الحق جنہوں نے خود کو فوجی قوت کے زور پر ملک کا مختار کل بنا رکھا ہے مارشل لاء کے بعد وجود میں آنے والی حکومت کو مارشل لاء ہی کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت کئی بار دیا جا چکا ہے اور اب بھی دیا جا رہا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال سندھ کا تازہ ترین سیاسی بحران ہے جو مسلمہ جمہوری طریقوں سے پیدا نہیں ہوا بلکہ تمام قرائن سے نظریہ ضرورت کے تحت لایا جانے والا بحران معلوم ہوتا ہے۔

اس سارے قصے پر تبصرہ کرتے ہوئے نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا ہے کہ صرف سندھ میں تبدیلی کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ فائدہ۔ عوام تو پورے نظام کی اور ہمہ گیر تبدیلی چاہتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی سندھ کے سربراہ سید قائم علی شاہ نے کہا ہے کہ سندھ میں جو بھی تبدیلی ہو وہ جمہوری طریقے سے ہونی چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سندھ کی طرح دوسرے صوبوں میں بھی حالات خراب ہیں لیکن وہاں ایک بار بھی فوج نہیں بھیجی گئی۔ انہوں نے حالات سدھارنے کی

غرض سے فوج کو واپس بلانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

ان کوائف سے صاف ظاہر ہے کہ سندھ میں بحران فطری اسباب کی بناء پر نہیں آیا بلکہ مصنوعی طریقے سے یا نظریہ ضرورت کے تحت لایا گیا ہے۔ ممکن ہے اس سے نمٹنے کے لیے جمہوری طریقے بھی استعمال کیے جائیں لیکن اگر ان طریقوں سے بعض لوگوں کی منشاء کے مطابق سید غوث علی شاہ کو نہ ہٹایا جاسکا تو کیا ہوگا؟ موجودہ بحرانی فضاء میں سندھ مسلم لیگ کے وزراء و اراکین اسمبلی تو ایک طرف رہے نظریاتی اختلافات کے باوجود سندھ کے عوام کی ہمدردیاں ویسے بھی سید صاحب کے ساتھ ہوگئی ہیں اور سندھ میں گورنر راج کے حامیوں کے لیے اس دیوار کو پھلانگ لینا کوئی آسان کام معلوم نہیں ہوتا۔(۱۱)

روزنامہ امن کے 4 اپریل 1987 کے اداریہ میں کہا گیا:

''قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے موقع پر آج جب ان کے عقیدت مند ان کی یاد تازہ کریں گے تو ملک کی معروضی صورتحال میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے واقعات کی روشنی میں حال تک کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ جن مقاصد کے لیے منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹا گیا تھا وہ کہاں تک پورے ہوئے اور جمہوری قوتوں پر ظلم وستم کا جو سلسلہ روا رکھا گیا اس سے کس حد تک مثبت نتائج حاصل کیے گئے۔

قائد عوام کے خلاف مقدمہ قتل کے سلسلے میں کس کس قانونی ہیر پھیر سے کام لیا گیا ان کا صحیح حال تو مؤرخ کا قلم ہی بیان کرے گا لیکن 1977 کے اور اس کے بعد کے واقعات سے ظاہر ہے کہ وہ ایک طبقاتی جنگ کا حصہ تھے جو کسی مضبوط اصول پر نہیں لڑی گئی۔ فوجی عدالتوں کے ذریعے اس جماعت کے اراکین کو جس کی منتخب حکومت کا تختہ الٹا گیا قید اور کوڑوں کی سزاؤں اور دوسری صعوبتوں سے کچلنے کی کوشش کی گئی لیکن کوڑوں سے کھال اتار دینے اور طویل ترین قید کی سزاؤں کے باوجود پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو حق کی آواز بلند کرنے سے روکا نہ جاسکا۔ ہر ممکن حربہ آزما کر دیکھ لیا گیا، ہر تدبیر کی گئی لیکن

نہ عوام کے ذہنوں سے شہید بھٹو کی یاد مٹائی جا سکی اور نہ ان کے اچھے کاموں پر پانی پھیرا جا سکا۔ بھٹو دور کے کتنے ہی اہم کام ایسے ہیں جن کو نہ طالع آزما مطلق العنان فوجی حکمران بدل سکے اور نہ ان کے وارث، وہ سول حکمران جو مارشل لاء کے زبانی خاتمے کے بعد آج بھی فوجی حکمرانوں کے اشاروں پر رقص کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، ختم کر سکے۔

شہید بھٹو کو تختہ دار تک پہنچانے سے پہلے کسی ستم ظریف نے کہا تھا کہ طالع آزماؤں کے لیے زندہ بھٹو سے مردہ بھٹو کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ یہ بات غلط نہ تھی۔ بھٹو آج بھی عوام کے دلوں میں زندہ ہے، بھٹو کا نظریہء سیاست ''بھٹوازم'' بھی نہ صرف زندہ بلکہ فروغ پا رہا ہے۔ بھٹو کی حیات میں جو حضرات بھٹو کے ساتھی تھے وہ چپ چاپ بھٹو کو پھانسی پر چڑھتے دیکھتے رہے۔ بھٹو کے رخصت ہونے کے بعد پہلا موقع ملتے ہی وہ تتر بتر ہو گئے اور سیاست کے بازار میں اپنی اپنی قیمت چکانے لگے لیکن کساد بازاری سے مجبور ہو رہے ہیں۔ شہید بھٹو کی بیٹی بے نظیر جمہوریت کا جو قافلہ لے کر نکلی ہیں اس میں البتہ تا حدِ نظر و خیال بھٹو کے نام لیوا نظر آ رہے ہیں۔ (۱۲)

حوالہ جات

۱۔ نجمی طاہر، سابق نیوز ایڈیٹر روز نامہ امن، ذاتی انٹرویو، کراچی، 20 جولائی 2017
۲۔ الحق متین، سابق چیف فوٹو گرافر، روز نامہ امن، ذاتی انٹرویو، کراچی، 30 جولائی 2017
۳۔ نجمی طاہر، سابق نیوز ایڈیٹر روز نامہ امن، ذاتی انٹرویو، کراچی، 20 جولائی 2017
۴۔ ایضاً
۵۔ خان، توصیف احمد، آزادیٔ صحافت میں اخباری تنظیموں کا کردار، کراچی پریس کلب،
۶۔ نجمی طاہر، سابق نیوز ایڈیٹر روز نامہ امن، ذاتی انٹرویو، کراچی، 20 جولائی 2017
۷۔ ایضاً
۸۔ عابدی، حامد، ایڈیٹر روز نامہ امن، ذاتی انٹرویو، کراچی، 20 جولائی 2017
۹۔ روز نامہ امن، اداریہ، 4 اپریل 1984
۱۰۔ روز نامہ امن، اداریہ، 30 اپریل 1984
۱۱۔ روز نامہ امن، اداریہ، 15 مئی 1985
۱۲۔ روز نامہ امن، اداریہ، 14 اپریل 1987

ہفت روزہ معیار

سینئر صحافی محمود شام نے جنوری 1976 میں کراچی سے ہفت روزہ معیار کا اجراء کیا۔ (۱) ایک اور سینئر صحافی اشرف شاد معیار کے ایگزیکٹو ایڈیٹر تھے جبکہ اس ادارے کے چیئرمین رؤف احمد شمسی اور چیف ایگزیکٹو احمد شمسی تھے۔ محمود شام نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ہفت روزہ قندیل سے کیا تھا۔ (۲) وہ ملک کے سب سے بڑے ہفت روزہ اخبار جہاں کے ایڈیٹر اور 70 کی دہائی میں شائع ہونے والے بائیں بازو کے ہفت روزہ الفتح کی ٹیم میں شامل رہے تھے۔ یوں شام صاحب کے ذہن میں بین الاقوامی معیار کے اردو ہفت روزہ نکالنے کا خیال تھا۔ ان کے ذہن میں مولانا ابوالکلام کے رسالہ الہلال اور لیل ونہار کے نقوش بھی تھے جو اپنے وقت کے بہترین نیوز میگزین تھے۔ ہفت روزہ معیار میں عالمی امور کے انچارج کہنہ مشق صحافی رفیع احمد فدائی تھے۔ ملک کے حالات، فنون لطیفہ، ادب، فلم اور تھیٹر جیسے موضوعات پر رپورٹنگ کے لیے نوجوان صحافی مجاہد بریلوی اور شہناز احمد کو شامل کیا گیا تھا۔ (۳) پاکستان کے مختلف شہروں سے رپورٹنگ کے لیے نامہ نگار مقرر تھے۔ معیار کے لے آؤٹ اور میک اپ کے لیے انور سمیع کو آرٹ ڈائریکٹر بنایا گیا تھا۔ (۴) انور سمیع کے والد 40 اور 50 کی دہائی میں کارٹونسٹ کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ معیار نے ایک متوازی پالیسی اختیار کی تھی۔ معیار میں لکھنے والوں میں فرہاد زیدی، ضمیر نفیس اور ڈاکٹر جعفر احمد نمایاں تھے۔ (۵) معیار پہلے ترقی پسند رجحانات کا حامل ہفت روزہ تھا۔ معیار نے ہمیشہ جمہوری نظام کے استحکام کی حمایت کی مگر معیار نے پیپلز پارٹی کی حکومت کی مختلف شعبوں مین مایوس کارکردگی، بیوروکریسی کی حکومت کی پالیسیوں کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں، ملک کے مختلف حصوں میں لوگوں کے مسائل اور خاص طور پر بلوچستان کے حالات کے بارے میں خصوصی فیچرز شائع کیے۔ بلوچستان کے بارے میں اس وقت رپورٹیں شائع ہوئیں جب بھٹو حکومت وہاں فوجی آپریشن کررہی تھی۔ معیار کی ایک اہم خصوصیت اس کے

ایڈیٹر محمود شام کے ملکی اور غیر ملکی سیاست دانوں سے انٹرویو تھے۔محمود شام نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ دنیا کے مختلف ممالک کے دورے کیے۔انہوں نے ان دوروں کا آنکھوں دیکھا حال معیار میں بیان کیا۔محمود شام اور اشرف شاد کے جاندار تجزیوں سے معیار کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔(۶)

معیار نے بھٹو حکومت کے دور میں تنقیدی رویہ اختیار کیا۔کراچی شہر میں چوری کی وارداتیں بڑھ گئیں۔ان ہی دنوں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کراچی گئے تو معیار کے اداریہ کی سرخی تھی''وزیراعظم شہر میں، چوریوں میں اضافہ''۔اسی طرح سینئر صحافی محمد جامی نے پاکستان ٹورازم کارپوریشن کی خراب صورتحال پر ایک رپورٹ تحریر کی۔اس رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ وزیر اعظم کی ہدایات پر عملدرآمد نہیں ہوا۔اس رپورٹ کے ساتھ اس صفحہ پر وزیراعظم کے کومنٹس اور ان کے دستخط کا عکس بھی شائع کیا گیا تھا۔اس وقت کے سیکریٹری داخلہ روئیداد خان نے اس رپورٹ کے مطالعہ کے بعد یہ سفارش کی کہ ہفت روزہ معیار کے خلاف آفیشل سیکریٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کے الزام میں مقدمہ درج کر کے گرفتار کیا جائے مگر وزارت قانون نے سیکریٹری داخلہ کی سفارش سے اتفاق نہیں کیا۔(۷)

معیار شائع کرنے والی کمپنی کے چیئرمین احمد شمسی اور ان کے بزنس پارٹنر حاجی عتیق کو وفاقی تحقیقاتی ادارے نے گرفتار کیا۔بعد میں غلام نبی نامی شخص نے احمد شمسی کی رہائی کے لیے تاوان طلب کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایف آئی اے کا آپریشن نہیں تھا۔وزیراعظم کی سخت ہدایات پر وزیراعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی نے کارروائی کی۔بااثر سیاسی شخصیت کے پاس سے شمسی اور ان کے ساتھی برآمد ہوئے۔معیار کے سرورق پر یہ رپورٹ شائع ہوئی۔غلام مصطفیٰ جتوئی جب وزیراعلیٰ بنے تو وزیر بلدیات جام صادق طاقت ور وزیر تھے۔ان کے قریبی ساتھی شاہ نواز جونیجو نے سانگھڑ میں اپنی بادشاہت قائم کی ہوئی تھی۔معیار نے ایک رپورٹ اس سرخی کے ساتھ شائع کی،''شاہ نواز جونیجو سانگھڑ کے بے تاج بادشاہ''۔(۸)

اسی طرح معیار کے اسلام آباد کے نمائندے ضمیر نفیس نے آرمی کنٹونمنٹ بورڈ کی حالت زار پر ایک تحقیقی رپورٹ شائع کی۔معیار کے ایڈیٹر اور نمائندے کے خلاف پشاور،

راولپنڈی اور کراچی میں مقدمات درج ہوئے۔ معیار کے ایڈیٹر، ایگزیکٹو ایڈیٹر اور رپورٹر کو دو برسوں تک مختلف عدالتوں میں مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہفت روزہ معیار کے ایڈیٹر محمود شام نے اپنے ایک آرٹیکل "Mayar - An Unfinished Agenda" میں تحریر کیا ہے کہ 1977 کے اوائل میں پیپلز پارٹی کی حکومت سول و عسکری خفیہ ایجنسیوں کے گھیراؤ میں آ گئی تھی۔ ایجنسیوں نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو عام انتخابات کے اعلان پر تیار کیا۔ ایجنسیوں کی رپورٹوں میں کہا گیا تھا کہ کوئی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر جیسے ہی وزیر اعظم بھٹو نے باقاعدہ انتخابات کا اعلان کیا تو ان ایجنسیوں نے حزب اختلاف کو متحد کرنے کا کام انجام دیا تو پاکستان قومی اتحاد (PNA) وجود میں آیا۔ پی این اے کے قیام کے ساتھ انتخابی مہم تیز ہو گئی۔ خفیہ ایجنسیوں نے مخالف سیاسی جماعتوں کو پاکستان قومی اتحاد میں ضم کرایا۔(۹)

انتخابی مہم کے سلسلے میں پہلا جلسہ ملتان میں ہوا۔ اس جلوس میں نوجوان بہت زیادہ جوش میں تھے اور غیر معیاری نعرہ بازی کر رہے تھے۔ شام صاحب نے اس وقت پیشگوئی کی کہ یہ انتخابات بہت زیادہ پُرتشدد ہونگے اور عملی طور پر ایسا ہی ہوا۔ انتخابات کے نتائج کو پاکستان قومی اتحاد نے قبول نہیں کیا۔ پی این اے نے احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ پہیہ جام، ہڑتال اور پُرتشدد واقعات سے انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔ ملکی حالات خراب ہو گئے۔ سعودی عرب، شمالی کوریا اور دیگر دوست ممالک کے سفیروں نے حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان مذاکرات شروع کرانے کے لیے حکومت اور حزب مخالف کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کرنا شروع کر دیں۔ میعار نے اپنے اداریوں میں غیر ملکی سفیروں کی ملاقاتوں کو بیرونی مداخلت قرار دیا۔ اس وقت کے سیکریٹری اطلاعات مسعود نبی نور نے معیار کے ایڈیٹر کو پیغام دیا کہ وزیر اعظم نے معیار کے ان اداریوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ انہیں خدشہ ہے کہ ان سفیروں کے ممالک سے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں۔ محمود شام اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے سیکریٹری اطلاعات سے کہا کہ وہ خود وزیر اعظم سے اس بارے میں بات کریں گے۔ شام صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے وزیر اعظم سے ایک ملاقات میں ان سفیروں کی سرگرمیوں پر تشویش کا اظہار کیا اور وزیر اعظم کو یاد دلایا کہ جیسے ماضی میں وزیر اعظم خود بھی بعض غیر ملکی سفیروں کی اس طرح کی سرگرمیوں پر

اعتراض کر چکے ہیں۔(۱۰)

ہفت روزہ معیار نے پیپلز پارٹی کے دور کی ایگزٹ کنٹرول لسٹ شائع کی اس لسٹ میں ان 250 افراد کے نام شامل تھے جن کے بیرون ملک جانے پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے معیار کے ایڈیٹر اور پبلشر محمود شام کو گرفتار کرلیا۔ محمود شام آفیشل سیکریٹ ایکٹ کے تحت اپنی گرفتاری اور مقدمے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ 4 اگست 1977 کو جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل تھی جب انہیں علی الصبح گلشن اقبال میں ان کی قیام گاہ سے گرفتار کیا گیا۔ ایف آئی اے کا عملہ اپنے ہیڈ کوارٹر کوئنز روڈ لے گیا مگر ایف آئی اے ہیڈ کوارٹر میں لاک اپ نہیں تھا، یوں انہیں سول لائنز پولیس اسٹیشن کے لاک اپ میں بند کردیا گیا۔ شام صاحب نے ساری رات لاک اپ میں گزاری۔ شام پر آفیشل سیکریٹ ایکٹ کی دفعہ (5) اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا گیا۔ محمود شام کے وکیل اقتدار ہاشمی نے متعلقہ مجسٹریٹ کے سامنے ضمانت کی درخواست دائر کی مگر محمود شام کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ محمود شام کو چار دن بعد ضمانت پر رہا کیا گیا۔ محمود شام کے خلاف اسپیشل جج اینٹی کرپشن کی عدالت میں کئی برسوں مقدمہ چلا۔ اسپیشل جج نے 1988 میں فیصلہ دیا کہ عدالت کو آفیشل سیکریٹ ایکٹ کے تحت مقدمہ چلانے کا اختیار نہیں ہے، یوں محمود شام اب تک اس مقدمے سے بری نہیں ہوئے۔(۱۱)

ہفت روزہ معیار کے 24 سے 31 دسمبر 1977 کے شمارے میں جیل میں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں پر حملے کی سازش کی سرخی کے ساتھ ایک رپورٹ شائع ہوئی۔ سندھ کے سیکریٹری داخلہ کنور ادریس نے معیار کو اظہار وجوع کا نوٹس جاری کیا۔ اس نوٹس میں کہا گیا تھا کہ یہ رپورٹ ویسٹ پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی دفعہ 27(1) کی خلاف ورزی ہے۔ اس کا جواب 7 دن میں دیا جائے اور اس کی خلاف ورزی پر 20 ہزار روپے کی زرضمانت جمع کرائی جائے۔ ملتان میں کالونی ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں نے اپنے معاشی مطالبات کے لیے جدوجہد کی تو ملز کی انتظامیہ نے پولیس کی مدد سے مزدوروں کا قتل عام کیا۔ ہفت روزہ معیار میں کالونی ٹیکسٹائل ملز کی صورتحال پر یکم فروری 1978 کو ایک رپورٹ شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کی سرخی تھی ''کالونی ٹیکسٹائل ملز میں موت کا رقص''۔ سندھ حکومت کے سیکریٹری داخلہ نے 30 ہزار روپے بطور ضمانت

جمع کرانے کا نوٹس دیا۔اس نوٹس میں کہا گیا تھا کہ اس رپورٹ کی اشاعت پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کے تحت غیر قانونی ہے۔ پھر معیار میں 2 فروری 1978 کو بھٹو حکومت کے تختہ اُلٹنے اور انہیں قصوری قتل کیس میں ملوث ہونے کی وجوہات کے حوالے سے ایک تجزیاتی رپورٹ شائع ہوئی۔اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اگر اسٹیل ملز کے قیام کا منصوبہ ترک کردیتے اور فرانس سے ری پراسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ منسوخ کردیتے تو اقتدار سے محروم نہیں ہوتے۔ رپورٹ کی سرخی یوں تھی ''بھٹو اسٹیل ملز ۔ری پراسیسنگ پلانٹ سے ہاتھ اٹھالیتے تو آج بھی برسراقتدار ہوتے''۔ سندھ کے محکمہ داخلہ نے مارشل لاء حکام کی ہدایت پر معیار کو اظہارِ وجوع کا نوٹس جاری کرتے ہوئے 20 ہزار روپے بطور ضمانت جمع کرانے کا حکم جاری کیا۔اس طرح 22 سے 29 اکتوبر 1977 کی اشاعت میں پنجاب کی سیاسی صورتحال پر ایک تجزیہ شائع ہوا۔اس تجزیہ میں کہا گیا تھا کہ پنجاب اُبل رہا ہے، عوام قربانیاں دینے کے لیے تیار ہیں۔حکومت نے اس تجزیہ کو خلاف قانون قرار دیتے ہوئے اظہار وجوع کے نوٹس میں تحریر کیا کہ اس تجزیہ میں عوام کو انتظامیہ سے تصادم کے لیے اُکسایا گیا ہے اور مارشل لاء حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس تجزیہ پر مشتمل رپورٹ کو پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس میں 1963 کی دفعہ 24 کی ذیلی دفعات کی خلاف ورزی قرار دیا گیا تھا۔نوٹس میں معیار کے پبلشر کو ہدایت کی گئی تھی کہ کراچی کے ڈپٹی کمشنر ساؤتھ کو 20 ہزار روپے کی ضمانت جمع کرائی جائے۔معیار کو 24 اور 25 مارچ اور 19 اپریل 1978 کو اسی طرح کے نوٹس دیئے گئے جن میں معیار میں شائع ہونے والی رپورٹوں جن کی سرخیاں تھیں ''ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کا مسئلہ طے ہونے تک پاکستان کی امداد روکنے کا دستاویزی ثبوت'' اور ''اندرونِ سندھ دو ہفتے میں کیا سے کیا ہوگا'' کو قابل اعتراض قرار دیا گیا اور 20، 20 ہزار روپے بطور ضمانت طلب کئے گئے۔ معیار کی انتظامیہ ضمانت جمع کرانے میں ناکام رہی تو سندھ کے محکمہ داخلہ نے 3 مئی 1978 کو معیار کا ڈیکلریشن منسوخ کرنے کا حکم نامہ جاری کیا۔اس حکم نامہ میں تحریر کیا گیا تھا کہ معیار کا ڈیکلریشن پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی دفعہ 31 کے تحت منسوخ کیا گیا۔ہفت روزہ معیار کے ایڈیٹر اور پبلشر نے ڈیکلریشن کی منسوخی کے فیصلے کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔سندھ ہائی

کورٹ نے 5 فروری 1980 کو معیار کے ڈیکلریشن کی منسوخی کو غیر قانونی قرار دیدیا۔ ہفت روزہ معیار سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد دوبارہ شائع ہونے لگا مگر معیار سمیت تمام اخبارات پر پری سنسر شپ عائد کردی گئی۔(۱۲)

معیار کے اکتوبر 1983 کے شمارے میں ڈاکٹر سید جعفر احمد نے 1963 کی طلبہ تحریک پر ایک آرٹیکل تحریر کیا۔اس آرٹیکل میں ان 12 طالب علم رہنماؤں کے بارے میں تفصیلات دی گئیں جنہوں نے ایوب خان کی آمریت کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ان طالب علم رہنماؤں کو کراچی بدر کردیا گیا اور پھر معیار شائع نہ ہوسکا۔

حوالہ جات

۱۔ ناز، ڈاکٹر احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، صفحہ 242

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ شام محمود، ہفت روزہ معیار، ذاتی انٹرویو، کراچی، 17 اگست 2017

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ احمد جعفر، (ڈاکٹر)، سابق ڈائریکٹر پاکستان اسٹڈیز سینٹر کراچی یونیورسٹی، ذاتی انٹرویو، 11 اگست 2017، کراچی

ڈیلی ڈان

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں یہ خیال تقویت پانے لگا کہ مسلمانوں کا ایک انگریزی کا اخبار ہونا چاہئے جو نوجوان نسل میں مسلم لیگ کا پیغام عام کر سکے۔ اس زمانے میں مسلمان انگریزی صحافت کی جانب متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ مسلم لیگی رہنما ایم اے اصفہانی انگریزی کے اخبار اسٹار آف انڈیا کے مینیجنگ ڈائریکٹر بنے تو انہوں نے مشہور صحافی پوتھن جوزف کو اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا تھا۔ پوتھن جوزف ایک دیہی عیسائی تھے۔ انہوں نے اسٹار آف انڈیا کو مسلمانوں کا ایک مؤثر اخبار بنا دیا تھا۔ خواجہ نورالدین نے اگست 1942 میں کلکتہ سے مارننگ نیوز شائع کرنا شروع کیا تھا مگر مسلم لیگ کا اعلیٰ معیار کا انگریزی کا اخبار یا ہفت روزہ اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ پیسہ اخبار کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم نے محمد علی جناح کو مشورہ دیا تھا کہ وہ انگریزی کا اخبار شائع کریں اور سیاسی رہنماؤں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ محمد علی جناح نے اخبار شائع کرنے کیلئے فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع کی اور 7 جون 1937 کو روزنامہ ٹریبیون لاہور میں ان کی اپیل شائع ہوئی۔ (۱)

جناح صاحب کی کوششوں کے نتیجے میں 26 اکتوبر 1941 کو ڈان پہلے ہفت روزہ کے طور پر دہلی سے شائع ہوا۔ حسن احمد ہفت روزہ ڈان کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ معروف صحافی زیڈ اے سلہری اور عزیز احمد ہفت روزہ ڈان کی پہلی ٹیم میں شامل تھے۔ محمد علی جناح نے ڈان کے لیے فنڈ جمع کرنے کے لیے کاٹھیاوار کا دورہ کیا تاکہ میمن برادری کو ڈان میں سرمایہ کاری کے لیے تیار کیا جا سکے۔ اس کا دفتر دہلی کے مشہور علاقے دریا گنج میں قائم کیا گیا۔ اخبار کا آغاز 6 صفحات سے ہوا جس کا سائز 20.5c / 27.5 تھا۔ ڈان شروع میں Flatbed مشین پر شائع ہوا۔ اس مشین میں ایک وقت میں دو صفحات چھپ سکتے تھے۔ پھر صفحات 8 اور اس کے بعد 12 کر دیئے گئے۔ ہفت روزہ اخبار کی قیمت 2 آنہ مقرر کی گئی تھی۔ پہلا اداریہ صفحہ نمبر 6 پر شائع ہوا جس میں اخبار کی

پالیسی بیان کی گئی تھی۔(۲)

اخبار کے آخری صفحے پر نوبل انعام یافتہ دانش ور شاعر رابن ناتھ ٹیگور کا قول شائع کیا گیا تھا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ ٹیگور کی تعلیمات اور شاعری ہندوستانی قومیت کی وکالت کرتی تھی۔ محمد علی جناح نے ڈان کو روزنامہ بنانے سے پہلے کوشش کی تھی کہ ایم اے ایچ اصفہانی کا اسٹار آف انڈیا دہلی منتقل ہو جائے۔ انہوں نے ایم اے ایچ اصفہانی سے اس پر خط و کتابت کی۔ جناح صاحب نے اخبار کی اشاعت کے بارے میں معمولی سے معمولی معلومات تک حاصل کیں جس میں ادارتی انتظامی عملے، دفتر کا کرایہ، خبر رساں ایجنسیوں API کی سروس، ٹیلی فون کا بل، اخبار کی پرنٹنگ، نیوز پرنٹ کی قیمت اور اشتہارات کے نرخ تک کے بارے میں معلومات شامل تھیں۔ جناح صاحب ایم اے ایچ اصفہانی اور ان کے بھائی سے طویل خط و کتابت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسٹار آف انڈیا کلکتہ سے شائع ہوتا رہے اور ڈان روزنامہ بن کر ہندوستان کے دارالحکومت دہلی سے شائع ہو۔(۳)

اصفہانی لکھتے ہیں کہ پھر ایک موزوں ایڈیٹر کی تلاش شروع ہوئی۔ اس زمانے میں کسی ہندو کے علاوہ انڈین تلاش کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اس وقت بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر عبداللہ بریلوی اور مارننگ نیوز کے عبدالرحمٰن صدیقی کے علاوہ اعلیٰ پائے کا صحافی دستیاب نہیں تھا۔ محمد علی جناح نے ایک خیراتی ٹرسٹ قائم کیا۔ اس ٹرسٹ کے چیئر مین خود جناح اور مینیجنگ ڈائریکٹر نوابزادہ لیاقت علی خان تھے۔ ٹرسٹ کی دستاویز میں ابتدائی طور پر ایک لاکھ 75 ہزار روپے کی رقم ظاہر کی گئی تھی۔ اس ٹرسٹ کے تحت اردو کا اخبار منشور اور انگریزی کا اخبار ڈان شائع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ حسن ریاض کو منشور کا ایڈیٹر اور پوتھن جوزف کو ڈان کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ پوتھن جوزف ایک ہندوستانی عیسائی تھے۔ اس طرح مسلمان اور ہندو ایڈیٹر کے بجائے ہندوستان کی ایک اور اقلیت عیسائی برادری سے ایڈیٹر منتخب کیا گیا تھا۔

معروف صحافی ضمیر نیازی کا کہنا ہے کہ پوتھن جوزف نے ڈان کو ایک جدید اخبار بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کے جانشین ایڈیٹروں الطاف حسین اور احمد علی خان نے ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایڈیٹر کے ادارے کو مستحکم کیا۔(۴)

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ ہی پوتھن جوزف کے ڈان چھوڑنے کا سبب بنا۔ وہ مسلم لیگ کی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ پوتھن جوزف نے دسمبر 1944 میں ڈان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ 1945 کے ابتدائی مہینوں میں جوزف نے جناح کو آگاہ کیا کہ وہ دو قومی نظریہ کی تھیوری کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ جناح نے پوتھن جوزف کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ پوتھن جوزف نے سیاسی اختلافات کی بناء پر یہ ملازمت چھوڑی تھی۔ پوتھن جوزف کے رخصت ہونے پر ان کے اسسٹنٹ یونس ابراھیم قائم مقام ایڈیٹر بنے۔ یونس کے دور میں ڈان کا معیار تیزی سے تنزلی کا شکار ہوا۔ اگست 1945 میں محمد حسین کو ایڈیٹر بنایا گیا۔

محمد علی جناح 7 اگست 1947 کو کراچی آئے اور 10 اگست کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ جناح صاحب نے 11 اگست 1947 کو آئین ساز اسمبلی میں تاریخ ساز تقریر کی۔ جناح تاریخی تقریر کے بعد گورنر ہاؤس چلے گئے۔ حکومت پاکستان کے سیکریٹری جنرل چوہدری محمد علی، جناح صاحب کی تقریر کے ان حصوں سے خوش نہیں تھے جن سے نئی ریاست کے سیکولر خدوخال واضح ہوتے تھے۔ چوہدری محمد علی نے پرنسپل انفارمیشن افسر کرنل مجید ملک کو ہدایت کی کہ تقریر کے کچھ حصوں کو اخبارات میں اشاعت سے روکنے کے لیے پریس ایڈوائس جاری کی جائے۔ پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے پریس ایڈوائس جاری کی۔ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین کو جب اس پریس ایڈوائس کا علم ہوا تو الطاف حسین نے پریس انفارمیشن کے افسروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ صرف انفارمیشن افسر F.D Douglas سے رابطہ ہوا۔ الطاف حسین نے ایف ڈی ڈگلس سے کہا کہ مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ پریس ایڈوائس کس کے حکم پر جاری کی گئی ہے۔ وہ فوری طور پر یہ معاملہ جناح صاحب کے سامنے لے جائیں گے۔ ڈگلس نے یہ پیغام پرنسپل انفارمیشن افسر کرنل مجید ملک تک پہنچایا۔ کرنل مجید ملک نے الطاف حسین کو یہ پیغام دیا کہ یہ پریس ایڈوائس نہیں تھی۔ (۵)

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو 16 اکتوبر 1951 کو لیاقت باغ راولپنڈی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ برسر اقتدار حکومت نے ملک کے پہلے وزیر اعظم کے قتل کی تحقیقات کے لیے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ روزنامہ ڈان نے قتل کے دو سال پورے ہونے پر 16 اکتوبر

1953 کو"Unavenged Martyr" کے عنوان سے زوردار اداریہ تحریر کیا۔ اس اداریہ میں الزام لگایا گیا کہ لیاقت علی خان قتل کی تحقیقات کے لیے لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس منیر کی قیادت میں تیار کی گئی رپورٹ کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس اداریہ میں مزید کہا گیا تھا کہ تحقیقاتی رپورٹ میں پولیس افسر نجف خان کو قتل کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا ان کو ترقی دیدی گئی ہے اور تین پولیس افسروں کی تحقیقاتی رپورٹ بھی شائع نہیں کی گئی ہے۔ رپورٹ تیار کرنے والے ایک افسر صاحبزادہ اعتزاز الدین پی اے ایف کے طیارے کے پراسرار حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ پھر ڈان نے 23 اکتوبر 1953 کو دوسرا اداریہ شائع کیا۔ اس اداریہ میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ قتل کی تحقیقات کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی خدمات حاصل کی جائیں اور قتل کی آزاد تحقیقات کرائی جائیں۔ اس مطالبے کی دیگر اخبارات مارننگ نیوز، امروز، جنگ، مسلمان اور ایوننگ اسٹار وغیرہ نے حمایت کی۔ اس وقت کے وزیر داخلہ مشتاق گورمانی نے قانون ساز اسمبلی میں کہا کہ لیاقت علی خان قتل میں بیرونی ہاتھ تھا۔ پھر روزنامہ ڈان اور ایوننگ اسٹار کے اشتہارات بند کردیئے گئے۔

7 اکتوبر 1958 کو ملک کے صدر اسکندر مرزا نے 1956 کا آئین منسوخ کرکے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا اور فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا۔ جنرل ایوب خان نے دیگر جرنیلوں کی حمایت سے 27 اکتوبر 1958 کو صدر اسکندر مرزا کو ان کے عہدے سے معزول کردیا اور خود صدر بن گئے۔ جنرل ایوب خان نے مارشل لاء کے آغاز سے آزادیٔ صحافت پر قدغن لگانا شروع کیں۔ روزنامہ ڈان نے اپنے فروری 1959 کے اداریہ میں پاکستان ٹائمز اور روزنامہ امروز پر حکومت کے قبضے کی حمایت کی۔ جنرل ایوب خان کی حکومت نے 26 اپریل 1960 کو پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس جاری کیا۔ اس قانون کے تحت اخبارات پر نئی پابندیاں لگادی گئیں مگر ان پابندیوں کے باوجود صحافیوں کی نمائندہ تنظیم پی ایف یو جے نے اس قانون کو چیلنج کیا اور اس قانون میں ترمیم کا مطالبہ کیا گیا۔ پھر پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس میں 1963 میں مزید ترمیم ہوئی۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کی حکومتوں کے جاری کردہ ترمیمی آرڈیننس کے تحت قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور عدالتوں کی رپورٹنگ کا حق

چھین لیا گیا۔ پی پی او کی پہلی ترمیم کی دفعہ (A)21 کے تحت اخبار کے پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کی ذمہ داری تھی کہ وہ سپریم کورٹ کے علاوہ کسی بھی عدالت یا نیم عدالتی ادارے یا ٹریبونل کی کارروائی کے وہ حصے شائع کریں جس کی اشاعت کی حکومت کی جانب سے باقاعدہ منظوری دی گئی ہو۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی کارروائی کی اشاعت متعلقہ اسمبلی کے اسپیکر یا ان کے مقرر کردہ افسر کی اجازت سے مشروط ہوگی۔ اخباری مالکان کی تنظیم آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (APNS)، ایڈیٹروں کی تنظیم کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز (CPNE) اور صحافیوں کی تنظیم پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) نے اس ترمیمی آرڈیننس کو مسترد کر دیا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے اس قانون کے خلاف 6 ستمبر 1963 کو 24 گھنٹے کی مکمل ہڑتال کا فیصلہ کیا۔ اے پی این ایس اور سی پی این ای نے ہڑتال کی حمایت کا اعلان کیا۔ روزنامہ ڈان نے ہڑتال والے دن یہ سرخی شائع کی:

"There will be no Dawn Tomorrow"

سی پی این ای اور اے پی این ایس نے پی ایف یو جے کے احتجاجی جلسوں میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ کراچی پریس کلب میں ہونے والے جلسے میں سی پی این ای کے صدر اور روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین اور اے پی این ایس کے میر خلیل الرحمٰن اور فخر ماتری نے شرکت کی۔ 21 ستمبر 1963 کو اخباری صنعت کی تینوں تنظیموں نے جوائنٹ ایکشن کمیٹی قائم کی جس کا کنوینئر الطاف حسین کو مقرر کیا گیا۔ حکومت اور جوائنٹ ایکشن کمیٹی کے مذاکرات کے بعد 10 اکتوبر 1963 کو حکومت نے پی پی او میں ترمیم پر اتفاق کیا۔ یوں اخبارات پر عائد پابندیاں نرم ہو گئیں۔ روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین مسلم لیگ کی قیادت کے قریبی حلیف جانے جاتے تھے مگر ان کے بعض اداریوں میں جمہوری نظام کے استحکام کی اہمیت کو اُجاگر کیا جاتا تھا۔ (٦)

ملک کے تیسرے گورنر جنرل غلام محمد نے پہلے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو برطرف کیا اور پھر آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ روزنامہ ڈان نے 17 اکتوبر 1954 کے ایڈیٹوریل میں اسمبلی کی تحلیل کی اس بنیاد پر مخالفت کی کہ اب آئینی عمل و ترقی میں تاخیر ہوگی۔ روزنامہ ڈان نے 26 اپریل 1956 کے اپنے ایک اداریہ میں آئینی اثرات سے پیدا ہونے والی نئی صورتحال

پر کڑی نظر رکھتے ہوئے تحریر کیا کہ اس سے پہلے آئین کی سیاہی خشک ہو جائے اور اس کی روح کو نکال دیا جائے، آئینی معاملات کو سنجیدگی سے لیا جائے، آئین کی حیثیت کو بلاخوف و خطر اور ہر صورت بلند رکھا جائے۔ اخبار اپنے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ آئین کو مذاق بنانے اور جمہوریت کا گلا گھونٹنے کی منظم طاقتور کوشش بھی کی گئی ہے۔(۷)

روزنامہ ڈان نے 17 مئی 1956 کے ایڈیٹوریل میں ایگزیکٹو کے مذموم مقاصد اور ان کے طریقہ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ جمہوری عمل میں دو غلط طریقے استعمال کیے گئے۔ اول یہ کہ گورنر جنرل نے ناجائز طور پر ریپبلکین کی حمایت کی اور دوئم یہ کہ صوبے کے وزیر اعلیٰ نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے پولیس اور اعلیٰ انتظامی عہدوں پر سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے بڑے پیمانے پر تبدیلی کر ڈالی۔

روزنامہ ڈان کے 24 جنوری 1972 کے اداریہ "After such kindness" میں تحریر کیا گیا کہ صدر بھٹو کو عوام کا مینڈیٹ حاصل ہے۔ صدر بھٹو نے کہا کہ اگر مخالفین نے انہیں مارشل لاء اٹھانے کے لیے دباؤ ڈالا تو عوام کے پاس جائیں گے اور اس معاملے میں ریفرنڈم کرائیں گے۔ اداریہ میں کہا گیا کہ مارشل لاء کے فوری خاتمہ کا مطالبہ خود بھٹو کا اپنا مطالبہ ہے۔ عوام نے جمہوریت کی بحالی کی تحریک کی بھرپور حمایت کی تھی۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کون لوگ مارشل لاء کے خاتمے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور ان کے کیا چھپے ہوئے مقاصد ہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ مارشل لاء کے خاتمے کے مطالبہ کو میرٹ پر طے کرنا چاہیے۔ صدر بھٹو نے عام آدمی کو امید دلائی ہے کہ ایک نئی صبح طلوع ہوگی۔ عوام کو 342 دن تک انتظار کرا کے ناامید کرنے کا جواز نہیں ہے۔(۸)

سندھ حکومت نے جون 1972 کو سندھی کو سندھ کی سرکاری زبان بنانے کا قانون اسمبلی سے منظور کرایا جس پر سندھ میں اردو بولنے والوں نے احتجاجی تحریک شروع کر دی اور فسادات شروع ہو گئے۔ صدر بھٹو نے اردو بولنے والے سیاسی رہنماؤں، دانشوروں، ادیبوں اور سندھی رہنماؤں اور ادیبوں کو راولپنڈی بلایا اور مذاکرات کے بعد معاہدہ ہوا۔

روزنامہ ڈان نے 23 جولائی 1972 کو اپنے اداریہ میں راولپنڈی معاہدے کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا کہ سندھ میں لسانی جھگڑے کا ایک معاہدہ کے تحت ختم ہونا ملک کے لیے

ایک نیک شگون ہے۔ اداریہ میں کہا گیا کہ راولپنڈی اور کراچی میں ہونے والے مذاکرات کے نتیجہ میں معاہدہ کے بعد امن وامان کی بحالی کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔(۹)

پیپلز پارٹی کی حکومت نے اقتدار میں آتے ہی سیاسی مخالفین کو گرفتار کرنا شروع کر دیا تھا۔ گرفتار ہونے والوں میں پیپلز پارٹی کے اپنے منحرفین بھی شامل تھے۔ ڈان نے 26 مارچ 1972 کو "Political Arrests" کے عنوان سے اداریہ میں کہا کہ موجودہ حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد انتظامیہ کا رویہ خاصا بہتر ہوا ہے مگر نوآبادیاتی سیاہ قوانین کے تحت سیاسی مخالفین کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ یہ قوانین اب تک نافذ ہیں۔ پیپلز پارٹی کے رکن صوبائی اسمبلی نبی بخش بھرگڑی کو مارشل لاء ریگولیشن 4 کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اسی طرح نیشنل عوامی پارٹی کے ایک رہنما بلوچستان اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے رکن کو پاکستان پینل کوڈ اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کی مختلف دفعات کے تحت گرفتار کیا گیا۔ سرکاری پریس رپورٹ میں یہ الزام لگایا گیا کہ یہ رہنما شاہ ایران کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ اگرچہ اس الزام کی تفصیلات ظاہر نہیں کی گئیں مگر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ان کارکنوں نے ایران میں مقیم اپنے بلوچ بھائیوں سے یکجہتی کے لیے ایک مظاہرہ کیا تھا۔ اداریہ میں کہا گیا کہ ہمارا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ یہ کارکن ایک سیاسی معاملے پر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے، انہیں ڈیفنس آف پاکستان رولز جیسے قانون شکن قانون کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اسی طرح کا معاملہ لائل پور سے پیپلز پارٹی کے رکن قومی اسمبلی مختار رانا کی گرفتاری کا ہے جو اپنی حکومت کی پالیسیوں پر احتجاج کر رہے تھے۔ ہماری گذارش ہے کہ حکومت اپنی موجودہ پالیسی تبدیل کرے اور سیاسی مخالفین کی گرفتاری کے لیے سیاہ قوانین استعمال نہ کرے۔(۱۰)

پیپلز پارٹی کی حکومت نے لائل پور سے منتخب ہونے والے رکن اسمبلی مختار رانا کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا اور فوجی عدالت سے سزا کے بعد مختار رانا کو قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے نااہل قرار دیا گیا اور اس نشست پر ضمنی انتخاب ہوا۔ اخبار نے 30 مئی 1972 کو اپنے اداریہ "Lylpur Election" میں تحریر کیا کہ ملک میں یہ انتخابی روایت رہی ہے کہ جو امیدوار حکومت کے قریب ہوتا ہے وہ ریاستی طاقت سے نتائج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد

ہے کہ خان عبدالقیوم خان نے انتخابات میں طاقت کا استعمال کیا اور بیلٹ بکس کے تقدس کو پامال کیا۔ دولتانہ نے کچھ زیادہ بہتر طریقہ استعمال کیا۔ ایوب خان نے پولیس اور بیوروکریسی کو انتخابات میں استعمال کیا مگر ہمیشہ ایک جیسا ہی نتیجہ آیا۔ عوام کے جمہوری حقوق غصب ہوئے اور جمہوری عمل متاثر ہوا۔ اگر ہم ماضی کی غلطیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو ملک کے پہلے ضمنی انتخابات مکمل طور پر آزادانہ اور منصفانہ ہونے چاہئیں۔(۱۱)

اخبار نے اپنے 11 جون 1972 کے اداریے میں سندھ میں سندھی زبان کو سرکاری زبان قرار دینے کے حوالے سے "Language Question" کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں کہا کہ زبان کے مسئلے کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے نقصانات اور مضمرات اب تک سنجیدگی سے محسوس نہیں کیے گئے۔ اگر اردو سندھی مسئلے پر کشیدگی بڑھی تو صوبہ کی سیاسی وسماجی زندگی پر اس کے خطرناک نتائج برآمد ہونگے۔(۱۲)

اخبار کے آزادئ صحافت کے موضوع پر 28 جولائی 1972 کو "Government and Press" کے عنوان سے شائع ہونے والے اداریے میں کہا گیا کہ ایک اور اخبار عتاب کا شکار ہوا۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ ایڈیشن کی اشاعت کے چند ماہ قبل اخباری کاغذ کا کوٹہ جاری ہوا تھا۔ اب یہ کوٹہ منسوخ کردیا گیا ہے۔ یہ انتہائی افسوسناک صورتحال ہے کہ اخبار کے خلاف سخت اقدام جنرل یحییٰ خان کے جاری کردہ قانون کے تحت کیا گیا۔ حکومت نے اخباری کاغذ کا کوٹہ منسوخ کرنے سے پہلے اخبار کو کوئی وارننگ نہیں دی۔ اداریہ میں کہا گیا کہ حکومت نے اخبار کو زائد صفحات شائع کرنے پر اظہار وجوع کا نوٹس بھی دیا ہے۔ حکومت کو اس معاملے میں معمول کا طریقہ کار استعمال کرنا چاہیے تھا۔ اگر کسی قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو پہلے وارننگ دی جانی چاہیے تھی۔ اسی طرح حکومت پنجاب نے چند ماہ قبل تین رسائل پر پابندی لگا کر ان کے ایڈیٹروں کو گرفتار کرلیا تھا۔ پھر یہ رسائل متواتر شائع نہ ہونے پر ان کا ڈیکلریشن منسوخ کردیا گیا تھا۔ حکومت نے پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی دفعات کو تکنیکی طور پر رسائل کو بند کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ صورتحال آزادئ صحافت کے اصولوں کے منافی ہے۔(۱۳)

اخبار نے پشاور میں ریڈیو پاکستان، ٹیلی وژن اور روزنامہ مشرق کے دفاتر پر نیشنل عوامی

پارٹی اور پختون خواہ کے کارکنوں کے پر تشدد مظاہرے کی مذمت کرتے ہوئے 21 ستمبر 1972 کو "The News Media" کے عنوان سے لکھا کہ نیپ اور پختون خواہ کے کارکنوں کا ریڈیو پاکستان، پاکستان ٹیلی وژن اور روزنامہ مشرق کے دفاتر کے سامنے پُر تشدد احتجاج افسوسناک ہے۔ اداریہ میں روزنامہ مشرق کے ادارتی عملے کو مظاہرین کی جانب سے دی جانے والی دھمکیوں کو افسوسناک قرار دیا گیا۔ اداریہ میں مزید کہا گیا کہ پشاور میں اس طرح کا واقعہ پہلا نہیں ہے، اس سے پہلے مختلف گروہوں نے اخبار کے عملے کو دھمکیاں دی تھیں جن لوگوں کو اخبار کی پالیسی سے شکایت تھی انہیں اس بات کا حق ہے کہ اخبار کی انتظامیہ تک اپنی شکایات پہنچائیں مگر انہیں ہنگامہ آرائی اور تشدد کا حق نہیں ہے۔ کسی بھی صورت صحافیوں کو دھمکیاں دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ (۱۴)

اکتوبر 1972 میں الیکشن کمیشن نے 1970 میں ہونے والے انتخابات کے بارے میں رپورٹ شائع کی۔ ڈان نے 26 اکتوبر 1972 کو "Election Commission's Report" کے عنوان سے لکھا کہ الیکشن کمیشن نے 1970 کے انتخابات کا تجزیہ کرتے ہوئے تنقید کے ساتھ تجاویز بھی دی تھیں۔ 1970 کے انتخابات ملک میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہونے والے پہلے انتخابات تھے اور ان انتخابات کو عمومی طور پر آزادانہ اور منصفانہ مانا جاتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ الیکشن کمیشن کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں اور ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو مستقبل میں منصفانہ انتخابات کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ کمیشن نے تجویز دی ہے کہ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ایک ہی دن انتخابات کرائے جائیں۔ کمیشن نے تجویز دی ہے کہ انتخابات کے انعقاد کے لے ایک جامع قانون بنایا جائے۔ سیاسی جماعتوں کے انتخابات پر ہونے والے اخراجات کی جانچ پڑتال کے لیے قانون کا ہونا ضروری ہے۔ خاص طور پر سیاسی جماعتوں کو دیگر مما لک سے ملنے والی امداد کی جانچ پڑتال ضروری ہے اور کسی عدالتی ایجنسی کو یہ فریضہ انجام دینا چاہیے۔ اپریل 1973 کو ملک میں عبوری آئین نافذ کیا گیا۔ (۱۵)

ڈان نے 18 اپریل 1973 کو اپنے اداریے بعنوان "The Interim Constitution" میں لکھا کہ قومی اسمبلی نے عبوری آئین منظور کر کے مارشل لاء کے خاتمے

کے لیے تمام لوازمات پورے کر دیئے۔ اب 21 اپریل کو مارشل لاء اٹھالیا جائے گا۔ اس عبوری آئین کی منظوری کا ہر طرف خیر مقدم کیا جائے گا، قطع نظر اس کے کہ عبوری آئین نے ملک کو کیا دیا مگر اس نے مستقل آئین کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ عوام 21 اپریل کو مارشل لاء کے خاتمے کا جشن منائیں گے۔ آئینی ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو ملک پھر 25 سال پیچھے چلا گیا ہے۔ برطانوی ہند حکومت کا 1935 کا قانون ہی آئینی ضرورت بن گیا ہے۔ عبوری آئین کے نفاذ سے طویل عرصے بعد جمہوری عمل کا آغاز ہوگا۔ اب یہ حکومت اور دیگر سیاسی قوتوں کی ذمہ داری ہے کہ جمہوریت کی روح کے مطابق اپنے فرائض انجام دیں۔ (۱۶)

روزنامہ ڈان نے 3 جنوری 1973 کو "Making a Constitution in a State of Emergency" کے عنوان سے ملک میں ایمرجنسی نافذ کرنے کے فیصلے پر تنقید کرتے ہوئے اداریہ لکھا۔ اس میں لکھا گیا کہ آئین کے تحت حکومت کو اختیار ہے کہ اگر ملک کے کسی حصے میں ہنگامی صورتحال ہو یا جنگ کا معاملہ ہو یا اقتصادی بحران ہو تو وفاقی اور صوبائی اسمبلیوں کے حالات قابو میں نہ رہیں تو ایمرجنسی نافذ کی جاتی ہے۔ عمومی طور پر دنیا بھر میں جو آئین نافذ ہیں ان کے تحت صدر اگر کوئی قانون نافذ کریں گے تو اس کو پہلے قومی اسمبلی میں پیش کریں گے مگر 1972 کے عبوری آئین کے تحت صدر کو یہ مطلق اختیار دیا گیا ہے کہ وہ غیر معینہ مدت تک کے لیے ایمرجنسی نافذ کر سکتے ہیں مگر اس کے تحت دو ماہ کے اندر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں اس کی منظوری لینا ضروری ہے مگر ایمرجنسی کی مدت میں 6 ماہ سے زائد کی توسیع نہیں ہوسکتی۔ ہمارے ملک کے عبوری آئین کے تحت ایمرجنسی کے نفاذ کے ساتھ بنیادی حقوق معطل نہیں ہوجاتے بلکہ صدر کو بنیادی حقوق معطل کرنے کے لیے ایک آرڈر جاری کرنا ہوگا جس میں تحریر ہوگا کہ شہریوں کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ کسی بنیادی حقوق کے نفاذ کے لیے عدالتوں سے رجوع کریں۔ اداریہ میں تحریر کیا گیا کہ اپریل 1972 میں صدر نے ایک آرڈر جاری کیا جس کے تحت تمام بنیادی حقوق معطل کر دیئے گئے، یوں حکومت کو مارشل لاء کا ایک متبادل طریقہ مل گیا۔ اگر وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے ڈیفنس آف پاکستان رولز (DPR) کے تحت جو اقدامات کیے ہیں ان کو مرتب کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ان اقدامات کا جنگ جیسی صورتحال یا اقتصادی بحران

جیسے معاملات سے تعلق نہیں ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس ضمن میں جو اقدامات کیے جائیں وہ ایمرجنسی کے دائرے میں آتے ہوں۔(١٧)

روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف گوہر کو 1973 میں متعدد بار گرفتار کیا گیا۔ اخبار نے 16 فروری 1973 کو "Altaf Gauhar's Arrest" کے عنوان سے اداریہ میں ایڈیٹر کی گرفتاری کی مذمت کرتے ہوئے لکھا کہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف گوہر کی رہائی کے چند مہینوں بعد گرفتاری ان سب لوگوں کے لیے تشویش کا باعث ہے جو آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ الطاف گوہر کو گذشتہ سال (1972) فروری کے مہینے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ سرکاری طور پر بتایا گیا تھا کہ گوہر کی گرفتاری 1969 میں ان کی سرکاری ملازمت سے برطرفی اور اس کے بعد ان کی سرگرمیوں سے متعلق تھی۔ سپریم کورٹ نے 20 اپریل کو الطاف گوہر کی رہائی کے احکامات جاری کیے تھے۔ پھر انہیں نئے احکامات کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ سندھ بلوچستان ہائی کورٹ نے الطاف گوہر کی نظر بندی کو 7 دسمبر 1972 کو غیر قانونی قرار دیدیا تھا۔ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں تحریر کیا کہ جیسا کہ الطاف گوہر کی نظر بند کے لیے جو ریکارڈ عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اس کے جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی معقول فرد اس ریکارڈ کی بناء پر الطاف گوہر کی نظر بندی کا حکم نہیں دے سکتا۔ اداریہ میں کہا گیا تھا کہ الطاف گوہر کی گرفتاری کے وقت بغیر وارنٹ ان کے گھر کی تلاشی لی گئی۔ الطاف گوہر جس کمرے میں موجود تھے اس کا دروازہ توڑ دیا گیا اور مسلح شخص نے انہیں باہر نکل جانے کو کہا۔ انتظامیہ کے اس روّیہ کو کسی صورت درست قرار نہیں دیا جا سکتا خواہ یہ روّیہ کسی بدنام مجرم کے ساتھ ہی کیوں نہ روا رکھا جائے۔ اداریہ میں کہا گیا ہے کہ ڈان کی پالیسی عوام کے مفاد میں محبّ وطن کی حیثیت سے تیار کی گئی ہے۔ یہ پالیسی صحافت کے منفرد بننے سے کمٹمنٹ ہے۔ ہماری پالیسی آزادانہ اور معروضی رپورٹنگ ہے۔(١٨)

بھٹو حکومت نے پیپلز پارٹی کے لائل پور سے رکن قومی اسمبلی مختار رانا کو گرفتار کر لیا۔ ڈان نے 4 فروری 1973 کو "Mukhtar Rana Prisoner of Conscience" کے عنوان سے اداریہ میں تحریر کیا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے مختار رانا کی رہائی کی تحریک شروع کی ہے۔ نیپ کی خصوصی کمیٹی نے تمام سیاسی نظر بندوں کی رہائی کے لیے ایک متحدہ محاذ قائم کیا ہے۔

یہ کوشش ایک طرف خوشی اور دوسری طرف تشویش کا باعث ہے۔تشویش کی بات یہ ہے کہ اب بھی متعدد سیاسی کارکن جیلوں میں ہیں، یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ حکومت ان امور پر ایک معتدل پالیسی اختیار کرے گی جس سے جمہوریت کے مستقبل پر خوشگوار اثرات برآمد ہونگے۔(۱۹)

روزنامہ ڈان نے 22 فروری 1973 کو "Where do we go from here" کے عنوان سے بلوچستان کی حکومت کی برطرفی اور سرحد حکومت کے مستعفی ہونے سے پیدا ہونے والے سیاسی ڈیڈلاک پر تشویش کا اظہار کیا۔اس میں کہا گیا کہ یہ صورتحال پیپلز پارٹی نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے درمیان تضاد کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔اس صورتحال سے کشیدگی بڑھے گی۔اس صورتحال کے نتیجے میں مغربی صوبے میں عوامی زندگی متاثر ہوسکتی ہے۔ اس تنازعہ میں فوج کا استعمال قطعی نہ کیا جائے۔ولی خان اور میر غوث بخش بزنجو کا کہنا ہے کہ فوج کو استعمال کرنے کے مشورے میں قومی یکجہتی متاثر ہوسکتی ہے۔ان دونوں رہنماؤں کا کہنا ہے کہ سرحد اور بلوچستان میں بڑے پیمانے پر فوجی دستے بھیجے جارہے ہیں۔اگرچہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں نے اس الزام کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ فوجی دستے فرنٹ لائن سے کنٹونمنٹ میں واپس جارہے ہیں۔صوبائی حکومتوں کے اس مؤقف میں تبدیلی بھی آنی چاہیے۔وفاقی حکومت کو اس معاملے میں فوج کو استعمال نہ کرنے اور دونوں صوبوں میں نمائندہ حکومتوں کی بحالی کے بارے میں واضح مؤقف پیش کرنا چاہیے۔پیپلز پارٹی کی حکومت نے دفعہ 144 نافذ کردی۔اس دفعہ کے تحت عوامی اجتماعات پر پابندی عائد کردی گئی۔(۲۰)

اخبار نے 27 جولائی 1973 کو "Ban on public assembly" کے عنوان کے تحت اداریہ میں تحریر کیا کہ عوامی اجتماعات پر دفعہ 144 کے تحت پابندی کے تناظر میں ایک نیا تنازعہ پیدا ہوا ہے۔حکومت کا کہنا ہے کہ جلسوں پر پابندی عوامی زندگی کے تحفظ کے لیے کی گئی ہے۔حزب مخالف کا استدلال ہے کہ شہروں میں دفعہ 144 کے مسلسل نفاذ سے حکومت نے مخالف جماعتوں کی اظہار کی آزادی کو غصب کیا ہے۔یہ معاملہ اس لیے بھی ایک دوسرا رخ اختیار کر گیا ہے کہ اصغر خان نے اعلان کیا ہے کہ وہ عوامی اجتماعات پر کسی قسم کی پابندی کو قبول نہیں کریں گے۔سندھ کے وزیراعلیٰ ممتاز بھٹو نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ صوبے میں کوئی فرد یا جماعت دفعہ

144 کی خلاف ورزی کرے گی تو قانون اپنا لائحہ عمل اختیار کرے گا۔ اس صورتحال میں محسوس ہوتا ہے کہ حکومت اور مخالف جماعتوں کے ایک گروپ کے درمیان تصادم کی صورتحال پیدا ہوگی۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے حکومت اور پریس کے تعلقات اور پریس کے مسائل کے لیے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کی قیادت میں پریس کمیشن قائم کیا۔ اخبار نے یکم ستمبر 1975 کو ایک اداریہ بعنوان "Press Commission" میں لکھا کہ یحییٰ بختیار کے یہاں سے پریس کمیشن کے قیام کے بارے میں بعض سوالات کے جوابات واضح ہونے ہیں مگر ابھی تک پریس کے شک وشبہات باقی ہیں۔ ابھی تک کمیشن کی ساخت اور ٹرمز آف ریفرنس واضح نہیں ہیں۔ یحییٰ بختیار نے پریس سے تعاون کی اپیل کی ہے مگر نئی پیشکش کے بغیر تعاون بے معنی ہے۔ پھر اخباری صنعت کے مالکان، ایڈیٹروں اور صحافیوں کی منتخب تنظیموں اور کمیشن کے درمیان اختلافات واضح ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کمیشن کو وہ تعاون حاصل ہوگا جو اس کو اپنے اہداف کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ (۲۱)

مارچ 1977 میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے قبل از وقت انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ پیپلز پارٹی کے مقابلے میں 9 مخالف سیاسی جماعتیں پاکستان قومی اتحاد (PNA) کے پلیٹ فارم پر متحد ہوگئیں۔ پیپلز پارٹی نے اپنے نئے منشور کا اعلان کیا۔ ڈان نے 27 جنوری 1977 کو ایک اداریہ "PPP Outlook and stratetgy" کے عنوان سے لکھا۔ اس اداریہ میں پیپلز پارٹی کے نئے انتخابی منشور کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا گیا کہ پی پی پی کا نیا انتخابی منشور بہت زیادہ وعدوں کی فہرست پر مشتمل نہیں ہے بلکہ پی پی پی کے ترقی پسندانہ سماجی تبدیلی کے عزم کی تجدید ہے۔ پیپلز پارٹی کی 1970 کی سماجی، سیاسی اور معاشی فلسفے کی پالیسی جو 5 سال سے جاری ہے وہ اس منشور میں موجود ہے۔ (۲۲)

مارچ 1977 میں منعقد ہونے والے انتخابات کے نتائج کو پیپلز پارٹی کی حکومت کے مخالف اتحاد پی این اے نے تسلیم نہیں کیا اور ایک پرتشدد احتجاجی مہم شروع کردی۔ ڈان نے 20 اپریل 1977 کو "Political prospects" کے عنوان سے اداریہ میں صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ایک پریس کانفرنس میں شراب اور جوئے پر

پابندی کا اعلان کیا۔ وزیراعظم نے یہ بھی اعلان کیا کہ موجودہ قوانین کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کی جائے گی اور 6 ماہ میں کونسل کی سفارشات تیار کرائی جائیں گی۔ انہوں نے پی این اے کے بعض اراکین سے کہا کہ وہ کونسل کی رکنیت اختیار کریں۔ انہوں نے سیاسی تنازعہ کے خاتمے کے لیے اپنی تجویز کو پھر دہرایا کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات دوبارہ کرائے جائیں۔ پی این اے نے وزیراعظم کی ان تجاویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ وزیراعظم عام انتخابات کرانے کے مطالبے کو نظرانداز کررہے ہیں۔ شراب اور جوئے پر پابندی متنازعہ مسائل نہیں ہیں۔ پی این اے نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا مطالبہ کرکے اسلامی قانون کے نفاذ پر بھی زور دے رہی ہے مگر وزیراعظم بھٹو نے سیاسی خلاء کے اہم مسئلہ کو حل کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی جس سے ان کے اس تنازعہ کے بارے میں سنجیدگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ انتخابات کی قانونی حیثیت کا معاملہ جس کی بناء پر پی این اے کا وجود عمل میں آیا پر دونوں فریق مخالف خیالات کا اظہار کررہے ہیں۔ حکومت اور پی این اے کی ذمہ داری ہے کہ اس اہم مسئلے کا حل تلاش کریں تاکہ جمہوریت برقرار رہے اور اس کی صحت مندانہ افزائش ہو سکے۔ (۲۳)

جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی کو بلیک لسٹ کردیا۔ وزارت اطلاعات ونشریات کی جوش ملیح آبادی کے سرکاری میڈیا پر آنے اور ان کے کلام کو نشر کرنے پر پابندی کی مذمت میں 31 دسمبر 1978 کو اپنے اداریہ میں لکھا کہ وزارت اطلاعات ونشریات کے جوش کے سرکاری میڈیا پر پابندی سے اس فیصلے کی بصیرت پر خدشات بڑھ گئے ہیں۔ یہ فیصلہ 1978 کے آخری دنوں میں اس وقت ہوا جب جوش کی زندگی کا چراغ گل ہونے کو ہے۔ یہ فیصلہ ایک ایسے شاعر کے خلاف ہے جس نے برطانوی راج کے خلاف آواز بلند کی۔ وزارت اطلاعات نے جوش کو بلیک لسٹ کرنے کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ کسی رسالے، ریڈیو اور پی ٹی وی پر جوش کے کلام شائع یا نشر نہیں ہونگے۔ یہ فیصلہ جوش کے 1974 میں ریکارڈ کیئے گئے ایک ریڈیو انٹرویو کی بناء پر کیا گیا۔ اس انٹرویو میں جوش نے مبینہ طور پر علامہ اقبال اور قائداعظم کے خلاف کچھ باتیں کی تھیں اور پاکستان کے قیام پر سوال اٹھایا تھا۔ اداریہ میں کہا گیا کہ جوش کے اس

انٹرویو پر تبصرہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس انٹرویو کا ٹرانسکر پٹ دستیاب نہیں ہے نہ ہمیں ان حالات کا علم ہے جب یہ انٹرویو ریکارڈ ہوا تھا۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ انٹرویو کے وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ یہ انٹرویو جوش کی زندگی میں نشر نہیں کیا جائے گا۔ اس مخصوص معاملہ سے ہٹ کر آرٹسٹک اور ادبی معاملہ پر سرکاری فیصلے سے شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ تخلیق کے لیے ہمیشہ آزادی ضروری ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے جب اپنی نظم شکوہ لکھی تھی تو اس قسم کے اعتراضات ہوئے تھے۔ جلیانوالہ باغ برِ عظیم اردو ادب کی معرکتہ الآراء نظم ہے۔ اس نظم پر برطانوی حکومت نے پابندی لگادی تھی۔ جوش نے کئی مشہور نعتیں بھی تحریر کی ہیں۔ وہ بالخصوص برطانوی استعماریت کے خلاف جدوجہد کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ جوش جب پاکستان آئے تو بھارت کے رہنما انہیں اپنے ملک میں رکھنے کے لیے بہت زیادہ پُر جوش تھے۔ اس صورتحال میں وزارت اطلاعات کی ذمہ داری ہے کہ اس کا موٴقف منطقی اور بصیرت سے بھرپور ہو۔ (۲۴)

جنرل ضیاء الحق نے 16 اکتوبر 1978 کو عام انتخابات غیر معینہ مدت تک ملتوی کرنے، سیاسی جماعتوں پر پابندی لگانے اور اخبارات پر پری سنسر شپ عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ملک میں نافذ کی جانے والی طویل ترین سنسر شپ تھی۔ ڈان نے 20 اکتوبر 1978 کو اپنے اداریہ میں تحریر کیا کہ نوقومی اخبارات کو پری سنسر شپ کے ملنے والے احکامات آزادیٔ صحافت کے منافی ہیں اور سنسر شپ کا مقصد منحرفین کی آوازوں کو خاموش کرنا ہے۔ ان اخبارات نے فیصلہ کیا ہے کہ حکومت کے اقدامات کے خلاف اخبارات تین دن تک شائع نہیں ہونگے اور سنسر شپ ختم نہ کی گئی تو یہ احتجاج غیر معینہ مدت تک جاری رہے گا۔ اداریہ میں کہا گیا کہ ڈان کسی فریق کے موٴقف سے مکمل طور پر متفق نہیں مگر حکومت کو سخت قسم کی اشتعال انگیزی کے بغیر یہ اقدام نہیں اُٹھانا چاہیے تھا۔ پریس قانون سے بالاتر نہیں ہے اور ہمارا موٴقف ہے کہ پریس کو قانون کے دائرے میں کام کرنا چاہیے مگر یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ جج کے فرائض انجام دے۔ حکومت کے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ وہ اخبارات کو آزادی سے فرائض انجام دینے کا موقع دے اور جو قانون کی خلاف ورزی کرے اس کے خلاف عام قوانین کے تحت کارروائی کی جائے۔ (۲۵)

روزنامہ ڈان نے 7 جون 1985 کو "The case against whipping"

کے عنوان سے کوڑوں کی سزا ختم کرنے کے حق میں اداریہ تحریر کیا۔ اس اداریہ میں کہا گیا تھا کہ اب سویلین حکومت نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اقتدار وقتی ہے مگر سول حکومت کو بعض اہم مسائل پر فوری توجہ دینی چاہیے۔ یہ مسائل 1977 میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد سے پیدا ہوئے۔ اس میں ایک مسئلہ سیاسی اور اخلاقی قیدیوں کو کوڑے مارنے کی سزا دینے کا ہے۔ فوجی حکومت نے اقتدار میں آنے کے بعد کوڑوں کی سزا پھر رائج کی تھی۔ 1971 میں اس سزا پر پابندی لگ چکی تھی۔ یہ ایک انتہائی معقول فیصلہ تھا۔ حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی قیدیوں کو فوراً کوڑے مارے جاتے ہیں اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو سیاسی جرائم کی بناء پر سزا دی جاتی ہے عوام کو ان سے ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور جن لوگوں کو مختلف جرائم کے ارتکاب پر سزا دی جاتی ہے ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ سیاسی منحرفین کو کوڑوں کی سزائیں دینا قدیم زمانے کی یاد دلاتا ہے۔ حکومت کو کوڑوں کی سزاؤں پر فوری طور پر پابندی عائد کرنی چاہیے۔ حکومت کو جرائم اور سزاؤں کو مستقبل میں ہونے والی قانونی اصلاحات میں شامل کرنا چاہیے۔ (۲۶)

ڈان نے 9 نومبر 1988 کو اپنے اداریے "Polls & Electronic Media" کے عنوان سے لکھا کہ سرکاری میڈیا نے اپنے روایتی انداز میں انتخابات کی کوریج میں جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ سرکاری ریڈیو اور ٹیلی وژن اپنے پروگراموں میں زمینی حقائق پیش نہیں کر رہے ہیں۔ سرکاری میڈیا خبروں کو اس انداز میں پیش کر رہا ہے جس سے نگران حکومت کی غیر جانبداری متاثر ہو رہی ہے۔ اگرچہ صدر بار بار اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ انتخابات شفاف اور انتظامی مشینری غیر جانبدار رہے گی تو اس صورتحال میں ضروری ہے کہ سرکاری میڈیا معروضیت کے اصولوں کے مطابق خبریں ترتیب دے۔ (۲۷)

ڈان نے 5 دسمبر 1988 کو سیاسی قیدیوں کی رہائی کے موضوع پر اپنے اداریہ میں لکھا کہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے سیاسی اور دیگر قیدیوں کی رہائی کے لیے ایک پیکیج کا اعلان کیا ہے۔ یہ پیکیج خاص طور پر ان قیدیوں کے لیے ہے جنہیں فوجی عدالتوں نے سزائیں دی تھیں اور اب تک اپنی سزائیں پوری کر رہے ہیں۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اپنی پہلی تقریر میں کہا کہ پیپلز پارٹی کے ماہرینِ قانون نے ان قیدیوں کی رہائی کے لیے ایک پیکیج تیار کیا ہے اور متعلقہ حکام سے ان

قیدیوں کی رہائی کے لیے بات چیت شروع کردی ہے۔صدر غلام اسحاق خان کو 8 نکات پر مشتمل یادداشت پیش کی گئی ہے۔(۲۸)

روزنامہ ڈان نے 17 مارچ 2002 کو "Let the people decide" کے عنوان سے اداریہ میں لکھا کہ صدر مشرف کے اکتوبر کے انتخابات میں بعض سیاست دانوں کو شرکت کی اجازت نہ دینے سے یہاں سے فوجی حکومت کے مقاصد کے بارے میں سوالات پیدا ہوگئے ہیں۔صدر مشرف سے ٹوکیو میں ایک پریس کانفرنس کے دوران سوال کیا گیا تھا کہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف انتخابات میں حصہ لے سکیں گے؟ تو صدر مشرف نے مختصر جواب دیا تھا کہ ''نہیں''۔یوں یہ سوال واضح ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت یا کسی اور حکومت کو کیا حق ہے کہ وہ کسی فرد کو ووٹ دینے یا عوام کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کرے؟ اگر حکومت یہ مؤقف برقرار رکھے گی تو آئینی شقیں بے معنی ہو جائیں گی۔بنیادی بات یہ ہے کہ عوام کو اکتوبر کے انتخابات میں یہ فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ کس کو حق حکمرانی کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ماضی میں ہونے والے انتخابات کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام نے انتہا پسندوں کو مسترد کیا ہے۔فوجی حکومت کو یہ بات پسند نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ ووٹرز مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی کے درمیان تقسیم ہیں۔اگر عوام کی اب بھی یہ خواہش ہے تو کسی قوت کو یہ حق نہیں کہ عوام کی خواہش کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ (۲۹)

روزنامہ ڈان نے 24 نومبر 2002 کو "Challenge for Mr. Jamali" کے عنوان سے اداریہ میں لکھا کہ ظفر اللہ جمالی نے اپنی 21 رکنی کابینہ کے ساتھ حلف اٹھالیا۔ان کی کابینہ میں پیپلز پارٹی کے 10 منحرف اراکین قومی اسمبلی بھی شامل ہیں۔ان کی کابینہ میں سابقہ دور کے وزیر خزانہ شوکت عزیز بھی شامل ہیں اور ایک خاتون بھی وزیر بنائی گئی ہیں۔ظفر اللہ جمالی کے لیے ایک اچھا موقع ہے کہ وہ شفافیت اور احتساب کا ایک جامع نظام قائم کریں۔جب جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالا تھا تو انہوں نے اپنے اثاثوں کا اعلان کیا تھا مگر ان کے باقی ساتھیوں نے ان کی پیروی نہیں کی۔ظفر اللہ جمالی کو اپنے وزراء، معاونین اور پارلیمانی سیکریٹریوں پر زور دینا چاہیے کہ وہ اپنے اثاثے ظاہر کریں۔اگر وزراء کسی تجارت یا کاروبار سے

منسلک ہیں تو یہ ریکارڈ کرانا چاہیے اور اپنے کاروبار سے دوری اختیار کرنی چاہیے اور اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ ان کی موجودہ حیثیت ان کے ذاتی کاروبار کے فائدے کے لیے استعمال نہ ہو۔(۳۰)

ڈان کے ایڈیٹر ظفر عباس نے 19 اگست 2017 کو اسپیشل رپورٹ میں "The Missing Pages of History" کے عنوان سے لکھا کہ رپورٹنگ کے میدان میں "No Go Area" کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے دباؤ رہتا ہے کہ بلوچستان کے مسئلے کو زیادہ اُجاگر نہ کیا جائے۔ مذہبی انتہاپسندی کے واقعات میں مرنے والے افراد کی تعداد کے بارے میں نہ لکھا جائے۔ اسی طرح لاپتہ افراد کا زیادہ ذکر پسند نہیں کیا جاتا اور ماورائے عدالت قتل کے واقعات کو زیادہ شائع کرنے کے اقدام کو بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ اس طرح حکومت اور سیکیورٹی ایجنسیوں کے درمیان Militacy پر قابو پانے کے بارے میں تنازعہ کو شائع نہ کرنے کی خواہش کی جاتی ہے۔ اسی طرح 6 اکتوبر 2016 کو سرل المیڈا کی رپورٹ کو قومی سلامتی کے لیے خطرہ قرار دیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میڈیا کا وہ حصہ جو ایسی ہدایات پر عمل کرتا ہے محب وطن قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض تجارتی اداروں میں کرپشن کے معاملات کو اُجاگر کرنے سے گریز کا مشورہ دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ نیشنل لاجسٹک سیل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے بارے میں تنقیدی رپورٹوں کو شائع نہ کرنے کا کہا جاتا ہے۔ ظفر عباس لکھتے ہیں کہ اخبارات کو نہ صرف ریاستی اداروں کی معروضی خبروں کو روکنے پر دباؤ کا سامنا ہے بلکہ انتہاپسند غیر ریاستی کردار بھی اپنی مرضی کے خلاف خبروں کی اشاعت کو روکنے کے لیے دباؤ ڈالتے ہیں۔ ایم کیو ایم نے 1980 کی دہائی میں یہ وطیرہ اختیار کیا تھا۔ بلوچ علیحدگی پسندوں کے بعض گروہ اسی طرح کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ پھر اسلامی انتہاپسندوں سے منسلک کچھ گروہ بھی اپنے خلاف شائع ہونے والی خبروں کی اشاعت کو رکوانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان تمام مشکل ترین حالات میں ڈان نے معروضی رپورٹنگ اور جمہوری عمل کے ارتقاء، شفاف انتخابات کے انعقاد اور 1973 کے آئین کی بحالی کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔(۳۱)

حوالہ جات

۱۔ Masood (Dr), Tahir, Dawn, The History Department of Mass Communication, University of Karachi, Page 25

۲۔ Ibid, Page 26

۳۔ Ibid, Page 27

۴۔ Ibid, Page 28

۵۔ ایضاً

۶۔ نیازی، ضمیر، صحافت پابند سلاسل، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی، صفحہ 131

۷۔ Rehman, Inamul, Public Opinion and Political Development of Pakistan, Oxford University Press, 1982, Page 15

۸۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 24 جنوری 1972

۹۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 23 جولائی 1972

۱۰۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 26 مارچ 1972

۱۱۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 30 مئی 1972

۱۲۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 11 جون 1972

۱۳۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 28 جولائی 1972

۱۴۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 21 ستمبر 1972

۱۵۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 26 اکتوبر 1972

۱۶۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 18 اپریل 1973

۱۷۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 3 جنوری 1973

۱۸۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 16 فروری 1973

۱۹۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 4 فروری 1973

۲۰۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 22 فروری 1973

۲۱۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، یکم ستمبر 1975

۲۲۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 27 جنوری 1977

۲۳۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 20 اپریل 1977

۲۴۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 31 دسمبر 1978

۲۵۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 20 اکتوبر 1978

۲۶۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 7 جون 1985

۲۷۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 9 نومبر 1988

۲۸۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 5 دسمبر 1988

۲۹۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 17 مارچ 2002

۳۰۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 24 نومبر 2002

۳۱۔ روزنامہ ڈان، اداریہ، 19 اگست 2017

ویوپوائنٹ

پاکستان ٹائمز کے سابق ایڈیٹر مظہر علی خان نے 14 اگست 1975 کو لاہور سے ہفت روزہ ویو پوائنٹ کا اجراء کیا۔ ویو پوائنٹ نے اپنے پہلے شمارے میں "Our Viewpoint" کے موضوع کے تحت اخبار کی پالیسی بیان کی:

"Viewpoint is intended to serve as an independent, non-partisan journal, owing allegiances not to any political party or group, but to the basic concepts of a democratic, progressive polity. Its primary aim is to invite attention to Pakistan's many problems-economic, political and social-, and to foster objective studies and impartial analyses, so that rational solutions can be evolved. Impartiality does not, however, connote neutrality or ambivalence. We have a fairly definite viewpoint in regard to the major problems that confront Pakistan, and this we will present and explain in these columns. At the same time it will be our endeavour to make this journal a forum for earnest debate on issues that matter to our people and country, so that a consensus may be encouraged on the basis of a realistic understanding and appraisal of each issue. (1)

معروف صحافی آئی اے رحمٰن، طاہر مرزا، ظفر اقبال مرزا، پروفیسر امین مغل، حمید اختر، حسین نقی، اکرم الحق، نوید بٹ، احمد عزیز ضیاء، ایلس فیض، شفقت تنویر مرزا اور خاور ممتاز نے مختلف اوقات میں ویو پوائنٹ میں ادارتی فرائض انجام دیئے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں حسین نقی کا آرٹیکل شائع ہوا جس پر ویو پوائنٹ کے ایڈیٹر مظہر علی خان اور حسین نقی کو سیکریٹ ایکٹ اور مارشل

لاءضوابط کے تحت گرفتار کیا گیا۔ مظہر علی خان جیل میں رہے۔ ان کی غیر موجودگی میں ویو پوائنٹ شائع ہوتا رہا۔(۲)

آئی اے رحمٰن نے قائم مقام ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ پھر 1981 میں آئی اے رحمٰن اور حمید اختر کو گرفتار کر لیا گیا۔ آئی اے رحمٰن اور حمید اختر 6 ماہ تک پنجاب کی مختلف جیلوں میں نظر بند رہے۔ اس دوران مظہر علی خان اور حسین نقی بھی گرفتار تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں ویو پوائنٹ کی ادارت کے فرائض ظفر مرزا نے انجام دیئے۔ ویو پوائنٹ میں مستقل لکھنے والوں میں اسلم خان نارو، ڈاکٹر اکمل حسین اور ڈاکٹر فیروز احمد نمایاں تھے جبکہ پروفیسر خواجہ مسعود، ایاز امیر، سلیم عاصمی، خالد احمد اور احمد حسن کے آرٹیکل شائع ہوتے رہتے تھے۔ سینئر صحافی اسلم شیخ کھیلوں پر تبصرہ کرتے تھے۔(۳)

آئی اے رحمٰن جن کی ویو پوائنٹ سے طویل رفاقت رہی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ویو پوائنٹ کی پالیسی مظہر علی خان طے کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ اسٹاف کے اراکین سے مشورہ کرتے تھے۔ رحمٰن صاحب کا کہنا ہے کہ ویو پوائنٹ میں کام کرنے والے صحافیوں کی اکثریت نے پاکستان ٹائمنر میں کام کیا تھا مگر ویو پوائنٹ کے پاس پاکستان پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (PPL) پاکستان ٹائمنر کو شائع کرنے والے ادارے کی طرح وسائل نہیں تھے۔ پھر یہ روزنامہ نہ تھا، لہٰذا روزنامہ کو درپیش چیلنج ویو پوائنٹ کو نہیں تھے۔ چنانچہ اس کا پاکستان ٹائمنر سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔(۴)

ان کا کہنا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے عائد کردہ سنسر شپ کے دور میں اس طرح تحریریں لکھی جاتی تھیں کہ سینئر حکام کو اعتراض نہ ہو مگر پھر بھی تحریریں سنسر ہو جاتی تھیں۔ پروفیسر امین مغل ہفت روزہ ویو پوائنٹ سے منسلک رہے۔ انہوں نے لندن سے Email انٹرویو میں کہا کہ ویو پوائنٹ کی پالیسی جمہوری اور سیکولر جرنلزم پر مبنی تھی جس کا مقصد جمہوری اقدار کی ترویج اور ایک سیکولر ریاست کے لیے رائے عامہ ہموار کرنا تھا۔ ویو پوائنٹ نے زندگی کے ہر شعبہ میں سماجی انصاف کے حصول کے لیے آواز اٹھائی اور پاکستان کے خطے میں غیر جانبدارانہ کردار کے لیے کوشش کی۔ ان کا کہنا ہے کہ ویو پوائنٹ کی ادارتی ٹیم ہر ہفتے ملتی تھی اور پالیسی سے متعلق امور پر تبادلہ خیال کرتی۔ جب ضروری ہوتا تو یہ اجلاس پہلے بھی ہو جاتا۔(۵)

ویو پوائنٹ کی تمام سرخیوں میں شائستگی اور سلجھاؤ تھا۔ سنسنی خیزی اور سخت زبان کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اکثر مضامین میں اعداد و شمار کی روشنی میں دلائل کے ساتھ تجزیے کیے جاتے تھے۔ Economic Notes کے تحت لکھنے والے اکثر سوشلسٹ نظریات کے صحافی اور تجزیہ نگار تھے۔ اس لیے اے۔ آر۔ شبلی، آئی اے رحمٰن یا ایم مسعود نے "Lands Reforms, Impact on Productivity" جیسے نظریاتی موضوعات پر زیادہ لکھا۔

قارئین کے خطوط میں اہم قومی اور بین الاقوامی مسائل پر خطوط شائع کیے جاتے تھے۔ "Book Review" عموماً زہیر صدیقی یا دیگر ترقی پسند صحافی ہی تحریر کرتے تھے۔ "The Arts" کا آخری مستقل سلسلہ ٹی وی یا فلم رپورٹر کا لکھا ہوتا تھا۔ اس کے آخر میں ایک زیر نمائش انگریزی فلم کا باتصور اشتہار بھی شائع ہوتا تھا۔ آخر میں پرنٹ لائن میں پبلشر کے طور پر احمد عزیز ضیاء کا نام شائع ہوتا تھا۔ آخری اندرونی اور بیرونی ٹائٹل پر اکثر پورے صفحے کے اشتہارات شائع ہوتے تھے۔ یوں یہ کل 36 صفحات کا ہفت روزہ اپنے اندر سیاست اور سنجیدہ موضوعات کے علاوہ ادب، کھیل، صحت اور ثقافت جیسی عوامی دلچسپی کا مواد بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

ترقی پسند سیاسی جماعتوں کی خبروں کے ساتھ ساتھ سوویت یونین کی خبریں، تصاویر اور ہندوستان کی سیاست پر رپورٹیں، خبریں اور تجزیے وغیرہ بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ضیاء الحق کے دور میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی تبصروں میں اس رسالے کے حوالے دیئے جاتے تھے۔ پاک سوویت تعلقات، پاکستانی ادیبوں کی روس میں اشاعت، سوویت یونین کی تصاویر، چیکوسلواکیہ میں خواتین کے حالات، سوویت لٹریچر اور رسالہ ''طلوع'' کا اشتہار وغیرہ ویو پوائنٹ کے اکثر شماروں میں شائع ہوتے رہے۔ کہیں کہیں داؤد کمال، نذیر کمال اور دیگر ترقی پسند شعراء کی نظمیں بھی شائع ہوتی رہیں۔ غیر ملکی رائٹرز کی تحریریں بھی اس میں شائع کی جاتی تھیں۔ (۶)

ویو پوائنٹ نے قادیانی فرقے کے ساتھ امتیازی سلوک کے خلاف اپنے ایک اداریہ میں آواز اٹھائی اور لکھا:

''مذہبی برداشت اور رواداری کی روایت قائداعظم نے خصوصاً اپنے کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی سے خطاب کے دوران ایک گائیڈ لائن متعین کردی تھی جس کے مطابق ہر فرد کو اپنی اپنی

عبادت گاہوں میں آزادانہ عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ مسلمانوں کے اپنے اندر بہت سے فرقے اور مسلک موجود ہیں، شیعہ اور سنی، دیوبندی اور بریلوی، آغا خانی، ذکریا اور بہت سے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے غیر مسلم اپنی تحریروں میں قرآن کی عبارت کا حوالہ دیتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی رسوماتی مجلس میں بھی قرآن کی تلاوت کی گئی تھی۔ جب تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں تو صرف احمدیوں کے ساتھ ہی کیوں امتیازی سلوک کیا جارہا ہے؟'' (۷)

ویو پوائنٹ نے جنرل ضیاء الحق کے 5 جولائی 1977 کو اقتدار سنبھالنے کے بعد انتخابات کرانے کے وعدے پر 28 اگست 1977 کو اداریہ تحریر کیا:

''چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے اور اقتدار سنبھالنے کے بعد زور دیتے ہوئے کہا کہ اس کی پالیسی جو پہلے سے متعین کردہ تھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور وہ اکتوبر میں انتخابات کرائیں گے۔ اصل بحران اس وقت شروع ہوا جب پی این اے (قومی اتحاد) نے مارچ میں ہونے والے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ طویل احتجاج ہوا، بالآخر قومی اتحاد کے لیڈروں سے کئی مذاکرات ہوئے، راولپنڈی معاہدہ کے تحت قومی اتحاد کے لیڈروں کا دوبارہ انتخابات کرانے کا مطالبہ تسلیم کرلیا گیا۔ قومی اتحاد کا مطالبہ تسلیم کرلیا گیا اور اسی سال اکتوبر میں انتخابات کرانے کا اعلان بھی کردیا گیا۔ لیکن قومی اتحاد کے کچھ لیڈروں کو تشویش تھی کہ بھٹو اقتدار سے باہر رہ کر زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے۔ یہ لیڈر چاہتے تھے کہ بھٹو کے اقتدار کے بغیر فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں صاف اور شفاف انتخابات منعقد ہوں۔ قومی اتحاد کے کچھ لیڈروں نے یہ محسوس کیا کہ انتخابات کے بعد بھی اگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوئے تو موجودہ بحران سے بھی بڑا بحران پیدا ہوجائے گا۔ لہٰذا بھٹو اور اس کی حکومت کا پہلے احتساب شروع کیا گیا کہ 1972 کے بعد سے گذشتہ پانچ سال تک جو جرائم سیاسی لیڈروں اور افسروں نے کیئے ہیں پہلے ان کا ٹرائل ہونا ضروری ہے۔''(۸)

جنرل ضیاء الحق نے دسمبر 1984 میں ملک میں اسلامی نام سے متعلق سوالات پر مشتمل ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا اور یہ حکم جاری کیا کہ ان سوالات کے مثبت جوابات کا مطلب ان کو مزید 5 سال کے لیے صدر منتخب کرنا ہوگا۔ ویو پوائنٹ نے 13 دسمبر 1984 کو جب رسالہ پر

سنسر لگا ہوا تھا تو اپنے اداریہ میں لکھا:

''19 دسمبر ریفرنڈم کا دن اسلام آباد میں سب کا موضوع بحث ہے۔لوگوں کے ذہنوں میں سوالات کلبلا رہے ہیں کہ کیا ریفرنڈم صاف اور شفاف منعقد ہونگے؟ کوئی بھی اس ریفرنڈم کے خلاف مہم نہیں چلا سکتا ہے؟ اور وہ لوگ جو بائیکاٹ کروانا چاہتے ہیں ان کو سزا دی جائے گی۔ ماحول کچھ اس طرح کا بنا دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی اس ریفرنڈم کے خلاف بات کرنے کی جرأت کر سکے۔''(۹)

ویو پوائنٹ نے 21 فروری 1985 کو احمدی فرقے کے خلاف امتیازی سلوک کے خلاف اداریہ میں لکھا:

ایک احمدی نامہ نگار نے اخبار کو مراسلہ لکھا جس میں اس نے دردمندانہ شکایت کی کہ احمدی کمیونٹی کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد ان کے ساتھ امتیازی سلوک بڑھ گیا ہے۔ احمدی عبادت گاہوں سے کلمہ طیبہ کو مٹایا جا رہا ہے، ان کے خلاف تشدد آمیز مہم چلائی جا رہی ہے اور ایک ٹاؤن میں تشدد کا واقعہ پیش بھی آیا ہے۔ اس کی توثیق پنجاب کے ہوم سیکریٹری نے تمام ڈویژنل کمشنروں کو یہ سخت احکام دے کر کر دی کہ جہاں جہاں احمدیوں کی مساجد پر دیواروں پر کلمہ طیبہ لکھا ہے اسے فوراً مٹا دیا جائے۔ 1974 کی آئینی ترامیم اور پچھلے سال آخری آرڈیننس تک تو ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد احمدیوں کی مساجد سے اذان پر پابندی بھی عائد کر دی گئی۔ یہاں دو سوال اٹھتے ہیں، کیا اقلیتی احمدیوں کو اکثریتی فرقے کے خلاف بولنے سے روکا جانا چاہیے؟ کیا احمدی اپنے عقائد کی تشہیر بھی نہیں کر سکتے؟ اسلامی تعلیمات کے مطابق تمام انسان بنیادی طور پر برابر ہیں اور اسلام برداشت کی اعلیٰ روایات رکھتا ہے اور اپنے اپنے عقائد و ایمان کی پریکٹس کرنے کی اجازت دیتا ہے۔''(۱۰)

حوالہ جات

۱۔ Weekly Viewpoint 14 August 1975

۲۔ مغل، امین، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر ہفت روزہ ویو پوائنٹ، مقیم لندن، انٹرویو بذریعہ E-mail، 15 اگست 2017

۳۔ رحمٰن، آئی اے، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر ہفت روزہ ویو پوائنٹ، ذاتی انٹرویو، لاہور، یکم جون 2017

۴۔ ایضاً

۵۔ مغل، امین، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر ہفت روزہ ویو پوائنٹ، مقیم لندن، انٹرویو بذریعہ E-mail، 15 اگست 2017

۶۔ ناز (ڈاکٹر)، احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، صفحہ 195-195

۷۔ مضمون قادیانی فرقے کے ساتھ امتیازی سلوک، ویو پوائنٹ، لاہور

۸۔ ویو پوائنٹ اداریہ، 28 اگست 1977

۹۔ ویو پوائنٹ اداریہ، 13 دسمبر 1984

۱۰۔ ویو پوائنٹ اداریہ، 21 فروری 1985

عوامی آواز

سندھ میں ترقی پسند طلبہ کی تحریک ہمیشہ طاقت ور رہی۔ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (SNSF) اور جئے سندھ طلبہ محاذ نے طالب علموں کی ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے جنرل ضیاءالحق کی آمریت کے خلاف طویل جدوجہد کی۔ اس جدوجہد میں ایک کردار ڈاکٹر جبار خٹک کا ہے۔ ڈاکٹر جبار خٹک کا تعلق کراچی کے علاقے لیاری سے ہے۔ ڈاکٹر جبار خٹک کے آباؤاجداد پختون خواہ سے ہجرت کر کے لیاری میں آباد ہوئے۔ ڈاکٹر جبار خٹک نے طالب علمی کے زمانے سے بائیں بازو کا انتخاب کیا اور سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں فعال ہو گئے۔ ڈاکٹر جبار خٹک کو بھٹو دور میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ جنرل ضیاءالحق کے دور میں وہ مشہور زمانہ جام ساقی کیس میں ملوث کیے گئے۔ سرحد اور سندھ کی جیلوں میں کئی سال تک مقید رہے۔ انہوں نے سندھ میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کیا مگر جیل میں ان کا زیادہ وقت مطالعے اور دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے مشاہدے میں گزرا۔ ڈاکٹر جبار خٹک نے سندھ کو اپنی دھرتی کی حیثیت سے اپنا لیا تھا۔ انہوں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے سندھی صحافت میں انقلاب برپا کرنے کا عزم کیا اور کمپیوٹر پر پہلا سندھی اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔(۱)

ڈاکٹر جبار خٹک نے اخبار کا نام ''عوامی آواز'' رکھا۔ انہوں نے مختلف دوستوں سے پیسہ جمع کیا۔ لیاری کے مرکزی علاقے چاکیواڑہ کے دو کمروں پر مشتمل دفتر سے عوامی آواز کا آغاز ہوا۔ معروف صحافی سہیل سانگھی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ایک اور ایکٹیوسٹ امداد اوڈھو ڈاکٹر جبار خٹک کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر جبار خٹک نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہر ایاز شاہ کی مدد سے سندھی زبان کا سوفٹ ویئر تیار کیا اور یہ بات طے کر لی گئی کہ عوامی آواز مکمل طور پر "Paperless" ماحول میں شائع ہوگا۔(۲)

1989 میں ترقی پسند کارکنوں کی ایک کھیپ جیلوں سے رہا ہوئی تھی۔ یہ وہ نوجوان تھے جنہوں نے سیاسی کارکن کی حیثیت سے پریس ریلیز اور پمفلٹ تحریر کرنے اور خفیہ اخبارات شائع کرنے کی تربیت حاصل کی ہوئی تھی، یوں سندھی کے مشہور ادیب اور صحافی انور پیرزادہ، جی ایم نقاش، فقیر محمد لاشاری، بدر ابڑو، محمد خان سولنگی، تاج محمد مری، اسلم خواجہ اور عباس جیلانی وغیرہ نے عوامی آواز کی پالیسی بنانے، سندھ کے حقوق خاص طور پر مقامی لوگوں (Indigeous Peoples) کے حقوق، طلبہ، مزدوروں اور کسانوں کی جدوجہد کو تقویت دینے والے مواد کی ترویج کی تھی۔(۳)

عوامی آواز نے بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت کے خلاف اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان اور عسکری اسٹیبلشمنٹ کی سازشوں کو عیاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بے نظیر بھٹو حکومت کے دور میں سندھ میں لسانی کشیدگی شدت اختیار کر گئی۔ کراچی سمیت سندھ کے شہروں میں سندھی مہاجر فساد کی بناء پر قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ یہ ایک بڑا خطرناک وقت تھا۔ سندھی کا اخبار ہونے کے باوجود عوامی آواز نے اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے جذباتیت سے بھرپور مواد کو ترجیح نہیں دی بلکہ معروضیت پر مبنی رپورٹنگ کی اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ ایسا مواد شائع نہ ہو جس سے صورتحال مزید خراب ہو جائے۔ یکم جون 1990 کو روزنامہ جنگ خیر پور کے نمائندے اور خیر پور پریس کلب کے صدر راحت کاظمی کو نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ پھر 2 جون 1990 کو لاڑکانہ کے دو سینئر صحافیوں پی پی آئی کے احمد حسین کمال اور روزنامہ نوائے وقت کے نمائندے مظاہر حسین نقوی کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ عوامی آواز کے ایڈیٹر سہیل سانگھی نے کراچی اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے سندھی اخبارات روزنامہ جاگو، کراچی کے ایڈیٹر فقیر محمد لاشاری، ہلال پاکستان کے ایڈیٹر اقبال دل، روزنامہ خادمِ وطن حیدرآباد کے ایڈیٹر علی قاضی اور روزنامہ عبرت حیدرآباد کے ایڈیٹر صغیر محمد کھوکھر سے اتفاق رائے کر کے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں اردو بولنے والے صحافیوں کے قتل کی مذمت کی گئی تھی۔ ان ایڈیٹروں نے اس بیان میں یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ اندرون سندھ اردو بولنے والے صحافیوں کے قتل سے حالات مزید خراب ہونگے۔(۴)

عوامی آواز نے کالاباغ ڈیم سے سندھ کو ہونے والے ممکنہ نقصانات کے بارے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے خبریں، سیاسی رہنماؤں و ماہرین کے بیانات، سیمینار اور ورکشاپس کی خبریں شائع کیں۔ سندھ میں پانی کی قلت کے اثرات، خاص طور پر سندھ کے ساحلی علاقوں میں دریائے سندھ کے صاف پانی کی کمی سے سمندر کے پانی کا زمینوں کو تباہ کرنے، مچھلیوں اور جھینگوں کی نسل ختم ہونے جیسے اہم موضوعات پر آرٹیکل اور اداریے تحریر کیے۔ روزنامہ عوامی آواز کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر جبار خٹک کا کہنا ہے کہ برسر اقتدار حکومتوں نے 27 برسوں میں متعدد دفعہ کالاباغ ڈیم کی تعمیر کے حق میں راہ ہموار کرنے کے لیے مہمیں چلائیں۔ ان مہموں کے دوران اخبارات کو لاکھوں روپے کے اشتہارات دیئے گئے۔ بعض سندھی اخبارات نے یہ اشتہارات شائع کیے مگر عوامی آواز نے اصولی طور پر ان اشتہارات کو شائع کرنے سے معذرت کرلی۔ یوں ادارے کو لاکھوں روپے کا نقصان ہوا اور یہ مالی نقصان ایک ایسے موقع پر ہوا جب ادارہ مالی بحران کا شکار تھا مگر عوامی آواز نے اپنی پالیسی پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا۔(۵)

1992 میں حیدرآباد کے قریب ایک گوٹھ ٹنڈو بہاول میں فوج کے دستے نے اچانک آپریشن کیا اور ایک خاندان کے 7 افراد کو ایک قطار میں کھڑا کر کے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ فوج کے ترجمان نے ہلاک ہونے والے افراد کو بھارت کی خفیہ ایجنسی راء کا ایجنٹ قرار دیا اور الزام لگایا کہ ان افراد کے قبضے سے بھارتی اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ عوامی آواز نے یہ خبر شائع کی کہ ان افراد کو زمین کے تنازع کی بناء پر قتل کیا گیا، یہ افراد بے گناہ تھے۔ حکومت نے اس خبر کی تردید کی اور یہ دباؤ ڈالا کہ اس واقعہ کو مزید کوَر نہ کیا جائے مگر متاثرہ خاندان کی زندہ بچ جانے والی خواتین نے احتجاجی مہم شروع کردی۔ ان خواتین کا مطالبہ تھا کہ اس خوفناک واقعے کی عدالتی تحقیقات کرائی جائیں۔ زمین کے تنازعہ پر ایک شخص کی ایماء پر اس کے دوست نے جو فوج میں میجر ہے لوگوں کو قتل کیا ہے۔ عوامی آواز نے اس سانحہ کی عدالتی تحقیقات کرانے اور ملزمان کو قرار واقعی سزا دینے کے لیے باقاعدہ مہم چلائی۔ اس مہم کی بناء پر اس وقت کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل آصف نواز نے اس سانحہ کی تحقیقات کروائیں تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ ہلاک ہونے والے افراد بے گناہ تھے۔ فوج کے سربراہ نے آپریشن کرنے والی فوجی ٹیم اور اس کے سربراہ جو ایک میجر تھے کو

معطل کرنے اور تحقیقات کرانے کا حکم دیا۔ عوامی آواز کی مہم کے نتیجے میں مذکورہ میجر کا کورٹ مارشل ہوا اور انہیں سزائے موت دی گئی۔ اس میجر کو سزا سے بچانے کے لیے کچھ نادیدہ قوتیں متحرک ہوئیں اور عوامی آواز پر دباؤ بھی ڈالا گیا مگر عوامی آواز نے احتجاج کرنے والی خواتین کی سرگرمیوں کو کور کیا۔ احتجاج میں شامل کئی خواتین نے خودسوزی کرلی۔ پھر فوجی عدالت کی سزا پر عملدرآمد ہوا اور ملزم فوجی افسر کو سزائے موت دیدی گئی۔(۶)

عوامی آواز کے جرأت مندانہ فیصلے کی بناء پر ملزموں کو سزا ملی اور زندہ بچنے والی خواتین کو انصاف میسر آیا۔ پھر عوامی آواز نے سندھ کی مقامی آبادی کے مسائل کو ہمیشہ اُجاگر کیا، خاص طور پر کراچی کے قدیم گوٹھوں کو ختم کرانے اور بلڈرز مافیا کے قیمتی زمینوں پر قبضے کے خلاف خبروں اور آرٹیکلز اور تصاویر کو خصوصی طور پر اُجاگر کیا گیا۔ عوامی آواز نے اپنے اداریوں میں اس بات پر زور دیا کہ کراچی کے دیہی علاقوں کی ترقی کو اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ یہاں کے قدیم گوٹھوں کو ختم کر کے ان کی جگہ ہاؤسنگ سوسائٹیز قائم کرنے کی پالیسی نہ صرف مقامی لوگوں کو حق ملکیت سے محروم کرے گی بلکہ اس سے علاقے میں ماحولیاتی مسائل بھی پیدا ہونگے۔ زرداری حکومت نے ملیر کے علاقے میں ہزاروں ایکڑ زمین بحریہ ٹاؤن کو کوڑیوں کے بھاؤ دیدی۔ بحریہ ٹاؤن کے اہلکاروں نے چھوٹے گوٹھوں پر قبضہ کرنے کے لیے وہاں کے لوگوں کو بھاری رقمیں دیں اور جہاں غریب لوگ آباد ہیں وہاں پولیس کی مدد سے ان لوگوں کو اپنی آباد زمینیں فروخت کرنے پر مجبور کیا۔ اس علاقے کے عوامی نمائندوں نے سابق صدر زرداری کی ایماء پر بحریہ ٹاؤن کے اہلکاروں سے تعاون کیا۔ اس علاقے کے سماجی کارکنوں نے بحریہ ٹاؤن کے غیر قانونی قبضے اور حکومت سندھ کی جانب سے قیمتی زمینیں بحریہ ٹاؤن کو دینے کے خلاف سپریم کورٹ سے رجوع کیا۔ بحرین ٹاؤن نے اس مقدمہ کی تفصیلات کی اشاعت کو روکنے کے لیے اخبارات کو لاکھوں روپے کے اشتہارات فراہم کیے۔ عوامی آواز نے ان سماجی کارکنوں کی پریس کانفرنس شائع کی اور مقامی لوگوں کے حقوق کے بارے میں اداریے اور آرٹیکل تحریر کیے۔ سپریم کورٹ نے جب بحریہ ٹاؤن کے خلاف فیصلہ دیا تو اس فیصلے کو شائع ہونے سے روکنے کے لیے اخبارات میں اشتہارات کی بھرمار کردی گئی۔ عوامی آواز نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو مکمل طور پر شائع کیا اور فیصلے پر عملدرآمد

کے لیے آرٹیکل اور اداریے تحریر کیے۔(۷)

عوامی آواز نے ہمیشہ قومی مالیاتی ایوارڈ کی تشکیل نو کے لیے آواز اٹھائی۔ جب 2010 میں پارلیمنٹ نے 18 ویں ترمیم منظور کی اور صوبوں کو پہلی دفعہ وہ حقوق ملے جو 23 مارچ 1940 کی قرارداد کے قریب تھے تو عوامی آواز نے یہ نکتہ اٹھایا کہ صوبوں کو دیئے گئے حقوق کو تحفظ دینے کے لیے قانون سازی کی جائے۔ اس طرح قومی مالیاتی ایوارڈ کی تشکیل نو کے لیے اداریے اور آرٹیکل تحریر کیے گئے۔ 18 ویں ترمیم کے نفاذ کے بعد قومی مالیاتی ایوارڈ کے لیے نیا فارمولہ تیار ہوا تھا۔ اس فارمولے کے تحت صوبوں کی آمدنی بڑھنی چاہیے مگر موجودہ حکومت نے قومی مالیاتی کمیشن کا اجلاس کئی برسوں سے طلب نہیں کیا، اس لئے نیا قومی مالیاتی ایوارڈ تیار نہیں ہوا جس وجہ سے سندھ اور بلوچستان اپنی آمدنی سے محروم ہو گئے۔ عوامی آواز قومی مالیاتی ایوارڈ کی تشکیل نو کے لیے مسلسل مواد شائع کر رہا ہے۔(۸)

عوامی آوز کے پہلے ایڈیٹر سہیل سانگھی کا کہنا ہے کہ عوامی آواز 1983 میں چلنے والی ایم آر ڈی کی تحریک سے پیدا ہونے والی سیاسی بیداری کا اظہار تھا۔ پیپلز پارٹی اور دیگر مخالف جماعتوں نے تیسرے فوجی آمر کو اقتدار سے ہٹانے اور 1973 کے آئین کی بحالی کے لیے یہ تحریک چلائی تھی۔ سندھ کے عوام نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ سندھ کے کچھ علاقوں میں فوج نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے بہیمانہ طاقت کا استعمال کیا۔ سندھ میں ہزاروں افراد نے گرفتاریاں دیں۔ ایم آر ڈی کی اس تحریک کو قومی اخبارات نے کوریج نہیں دی۔ عوامی آواز کے بانی ڈاکٹر جبار خٹک اور سہیل سانگھی اس دور میں جام ساقی سازش کیس میں 5 برسوں تک قید رہے، یوں عوامی آواز کی اشاعت کا خیال سنٹرل جیل کراچی میں پروان چڑھا۔ اس اخبار کو مزاحمتی صحافت کا محور بنانے کا فیصلہ کیا اور سہیل سانگھی کی ادارت میں شائع ہونے والے عوامی آواز نے مزاحمتی صحافت کا آغاز کیا، بعد میں دیگر اخبارات نے بھی اس طرزِ صحافت کو اپنایا۔ سہیل سانگھی کہتے ہیں کہ عوامی آواز کی بنیادی پالیسی جمہوری نظام کی حمایت اور سندھ کو کوریج دینا تھی۔ وہ اخبار کے افتتاحی پرچے کے عنوان کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس عنوان میں سندھ کی تمام سیاسی جماعتوں اور گروپوں کے رہنماؤں کی تصاویر دی گئی تھیں۔ اس کا کیپشن تھا ''سندھ کے مختلف سیاسی

رنگ اور لہجے''۔ وہ کہتے ہیں کہ عوامی آواز نے اس طرح سندھ میں موجود تنوع کا اظہار کیا۔(۹)

سہیل سانگھی مزید کہتے ہیں کہ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تمام جمہوری قوتیں قریب آئیں۔ سہیل سانگھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سندھ میں متحرک چھوٹی سیاسی جماعتوں اور گروپوں کی سرگرمیوں کی ترویج نہیں ہوتی تھی، یوں ان کے آپس میں رابطے قائم ہوئے۔ یہ سیاسی گروپ سندھ کے جو مسائل اُٹھا رہے تھے وہ اُجاگر ہوئے۔ عوامی آواز نے ملک میں جمہوری نظام کے استحکام کے لیے اداریے، آرٹیکل، خبریں اور تجزیے شائع کیے۔ پھر سندھ کے بنیادی حقوق جس میں پانی کی تقسیم، کالا باغ ڈیم بننے سے سندھ میں ہونے والے نقصانات، این ایف سی ایوارڈ اور مزید صوبائی خودمختاری کے لیے اداریے اور آرٹیکل وغیرہ شائع کیے گئے اور پبلک فورمز منعقد کیے گئے۔ عوامی آواز نے کسانوں، مزدوروں، طالب علموں، غریب عوام، خواتین اور اقلیتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ سندھ میں گذشتہ صدی کی آخری دہائیوں میں تعلیم کی شرح بڑھنے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام اور ملازمتوں کے مواقع بڑھنے سے متوسط طبقے اور نچلے متوسط طبقے میں آگہی پیدا ہوئی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے پسند کی شادی کا حق استعمال کیا۔ یوں کاروکاری کا معاملہ سنگین ہوگیا۔ بچپن کی شادی وغیرہ جیسے مسائل کو عوامی آواز نے بھرپور طریقے سے اُجاگر کیا۔ عوامی آواز نے یوں سندھی سماج کو اوپن کرنے میں معاون کردار ادا کیا۔ عوامی آواز کی اس روش کو دیگر سندھی اخبارات نے بھی اپنایا، سماجی برائیوں کے خاتمے کے لیے عوامی آواز نے ایک اہم کردار ادا کیا۔(۱۰)

سہیل سانگھی کا کہنا ہے کہ سندھ میں سماجی برائیوں کے خلاف ہونے والی قانون سازی کے لیے عوامی آواز اور دیگر سندھی اخبارات نے آواز اٹھائی۔ سندھ میں ہندو برادری ایک بڑی تعداد میں آباد ہے۔ سندھ کے ضلع تھرپارکر میں ہندو اکثریت میں ہیں۔ یہ برادری لڑکیوں کے اغواء اور زبردستی مذہب کی تبدیلی کے مسائل سے دوچار ہے۔ زبردستی مذہبی تبدیلی کا شکار کم سن بچیاں ہوتی ہیں۔ عوامی آواز نے ہمیشہ ہندو برادری کے ساتھ روا رکھے گئے غیر منصفانہ سلوک کو اُجاگر کیا، یوں رائے عامہ ہموار ہوئی اور گذشتہ سال سندھ اسمبلی نے زبردستی مذہب کی تبدیلی کے خلاف بل پیش کیا۔ اس قانون کے تحت 18 سال سے کم عمر کی لڑکیوں اور لڑکوں کے مذہب کی

تبدیلی پر پابندی عائد ہوگی مگر مذہبی حلقوں کی دھمکیوں اور دباؤ پر پیپلز پارٹی کی قیادت نے بل واپس لے لیا۔عوامی آواز نے بل کی واپسی کو بنیادی انسانی حقوق پر قدغن قرار دیا۔عوامی آواز نے نئے نوجوان لکھنے والوں کی تحریروں کو خصوصی طور پر شائع کیا۔ان میں سے بیشتر وہ سماجی کارکن تھے جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف مزاحمت کی تھی، یوں جمہوریت کی اہمیت کو سمجھنے والے کئی صحافی عوامی آواز کے توسط سے میڈیا کے شعبے میں داخل ہوئے اور اہم مقام حاصل کیا۔یوں عوامی آواز کو سندھی اخبارات کی نرسری کہا جا سکتا ہے۔(۱۱)

عوامی آواز کا ادارتی صفحہ قارئین میں مشہور رہا اور معروف دانشوروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے رائے عامہ بنانے کا فریضہ انجام دیا۔ان دانشوروں میں سوبھو گیان چندانی، امر جلیل، قمر شہباز، انور پیرزادو، تاج بلوچ، بدر ابڑو، مہتاب راشدی، فہمیدہ حسین، جاوید قاضی، شبیر شر، خالق جونیجو، امان اللہ شیخ اور وارث رضا شامل ہیں۔(۱۲)

عوامی آواز کے 29 دسمبر 2007 کے اداریے میں بے نظیر بھٹو شہید کے قتل کے حوالے سے لکھا گیا:

> ''محترمہ بے نظیر بھٹو کو غیر جمہوری طاقتوں نے راستے سے ہٹایا ہے۔اس میں نہ آج کوئی شک ہے نہ ہی کل تھا۔بے نظیر بھٹو غیر جمہوری اور عوام دشمن طاقتوں کے لیے سراپا دہشت تھیں۔بے نظیر بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کا تسلسل تھیں۔دنیا میں پاکستان کی شان بڑھانے والی عالمی طور پر مشہور شخصیت تھیں۔سب سے بڑھ کر ملکی عوام کی محبوب لیڈر تھیں۔سلام ہے ان کی جرأت مندی پر کہ انہوں نے اپنی زندگی کو درپیش خطرات دیکھتے ہوئے بھی 18 اکتوبر 2006 کو ملک واپس آنے کا فیصلہ کیا اور پہلے 24 گھنٹے کے اندر ہی ان پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن وہ اعصابی طور پر کمزور نہ تھیں، فہم وفراست سے عوامی سیاست جاری رکھی اور روایتی ملکی سیاست میں مردوں کو مات دی۔بے نظیر کے قاتلوں کے متعلق یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ وہ سب عناصر جو جمہویت کے دشمن ہیں جو عوام کی ترقی اور خوشحالی کے دشمن ہیں جنہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کیا انہی ہاتھوں

نے بے نظیر بھٹو کو بھی شہید کیا ہے۔ ملک کی عوامی لیڈر کے قتل کی تعزیتیں بھی عوام خود ہی وصول کر رہی ہے۔"(۱۳)

21 اپریل 2010 کے اداریے میں لکھا گیا:

"صدر پاکستان آصف علی زرداری نے 18 ویں آئینی ترمیم پر دستخط کر دیئے ہیں۔ صدر کی طرف سے اس آئینی مسودے پر دستخط کرنے کے بعد صدر کے اختیارات اب وزیر اعظم پاکستان کو منتقل ہو گئے ہیں۔ صدر زرداری کے لیے اس مسودے پر دستخط کرنا اعزاز کی بات ہے۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعتوں نے سیاست سے بالاتر ہو کر اس ترمیم کو منظور کیا ہے۔ یہ 18 ویں ترمیم عوام کے ووٹ کا تقدس بحال ہونے، پارلیمنٹ اور حکومت کو اپنا وقت پورا کرنے اور عوام کے مینڈیٹ کے تحت مکمل طور پر کام کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ 18 ویں ترمیم سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے بعد پہلی مرتبہ یہ پارلیمنٹ مضبوط ہو گی۔ اختیارات میں توازن ہو گا اور صوبوں کو خود مختاری ملے گی۔"(۱۴)

28 جنوری 2010 کے اداریے میں لکھا گیا:

"قومی اسمبلی نے اپنے جاری اجلاس میں مزدور تنظیموں سے پابندی ختم کرنے کے لیے ایک بل پیش کیا ہے۔ یہ بل پیپلز پارٹی کی طرف سے یاسمین رحمٰن نے پیش کیا۔ مزدوروں کے حقوق کو تسلیم کرنے کی یہ کوشش موجودہ جمہوری حکومت کا ایک ایسا اقدام ہے جس سے اچھائی کی امید کی جا سکتی ہے۔ کالے آرڈیننس 2000 کے بل کی منظوری کے بعد اس پر عمل کرانے کا مرحلہ حکومت کے لیے بہت اہم ہو گا۔ سابقہ فوجی سربراہ جنرل مشرف نے 12 اکتوبر 1999 کو ملک کے اندر غیر قانونی اور غیر آئینی اختیارات کو تقویت پہنچانے کے لیے ایسے آرڈیننس کا سہارا لیا جو اپنی روح میں عوام دشمن اور جمہوریت دشمن قانون ہے۔"(۱۵)

23 جنوری 2010 کے اداریے میں لکھا گیا:

''عورتوں کے تحفظ کے حوالے سے انسانی حقوق کی تنظیموں کے ساتھ عورتوں کی تنظیموں کا بھی ایک عرصے سے مطالبہ رہا ہے کہ حکومت عورتوں کی آزادی اور حقوق کی حفاظت کے لیے قانون بنائے۔ اس سلسلے میں سابقہ اطلاعات ونشریات کی وزیر شیری رحمٰن نے مسلسل کوشش کر کے مختلف تنظیموں کی مدد سے یہ بل تیار کیا ہے جس میں عورت کی دفتری آزادی اور حراساں کرنے کے خلاف قانون بنایا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عورتوں کی آزادی اور ان میں سے خوف ختم کرنے کا عمل ایک بہتر سماجی سوچ اور بہترین روّیوں کو تقویت دے گا۔ سماج آگے بڑھے گا اور سماج دشمن لوگوں کو اپنے رویوں میں بہتری لانی پڑے گی۔''(۱۶)

6 مارچ 2010 کے اداریے میں لکھا گیا:

''ہم سمجھتے ہیں کہ طالب علموں کی یونین کی بحالی میں وہ قوتیں رکاوٹ ڈال رہی ہیں جن کے یونیورسٹیوں اور کالجوں میں غیر جمہوری مفادات کارفرما ہیں۔ دوسری طرف غیر جمہوری ذہن رکھنے والے تعلیمی اداروں کے ذمہ دار اساتذہ بھی نہیں چاہتے کہ ان کی ہٹ دھرمی ختم ہو۔ وہ طالب علموں کے فنڈز پر مالک بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ آج کالج اور خاص طور پر یونیورسٹیوں میں سیلف فائنانس کے نام پر تعلیم کو کاروبار بنانے کا سلسلہ جاری ہے۔ طالب علموں کی یونین کی بحالی کے حوالے سے حکومت کو چاہیے کہ وہ طالب علموں کی آئینی سیاست کو جمہوری آزادی کے لیے قانون بنانے کی کوشش کرے کیونکہ جمہوریت کی مضبوطی میں اور عوامی آزادی کی تحریکوں میں طالب علموں نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے آمرانہ قوتیں طالب علموں کی یونین سازی سے ڈرتی ہیں لیکن جمہوری حکومت کو ان کے جمہوری حقوق کا خیال کرنا چاہئے۔'' (۱۷)

20 مئی 2011 کے اداریے میں لکھا گیا:

''قومی اسمبلی کے قانون، انصاف اور پارلیمانی معاملات کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے سندھ سمیت مختلف مادری اور قومی زبانوں کو قومی درجہ دینے والے بل کو ملک دشمن قرار دے کر اکثریت سے دوبارہ رد کر دیا ہے۔ یہ بل پیپلز پارٹی کے یوسف تالپور نے جمع کرایا تھا جس پر 22 ممبروں کے دستخط بھی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ بڑے عرصے کے بعد ملک میں جمہوریت آئی ہے اس لیے نئی صحت مند بنیاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ انصاف پر مبنی صاف نظام کے لیے ضروری ہے کہ قوموں کو مطلوبہ حیثیت دی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قومی زبانوں کو رد کرنا قوموں سے انکار کے برابر ہے اور مضبوط وفاق کے لیے ضروری ہے کہ صوبوں اور قوموں کو مضبوط کیا جائے لیکن وفاق کے نام پر صوبوں اور قوموں کو کمزور سے کمزور کیا جا رہا ہے۔'' (۱۸)

3 جولائی 2017 کے اداریے میں لکھا گیا:

''پاناما کیس کے بعد جہاں اداروں اور عدلیہ کا کردار اہم بن گیا ہے وہاں جمہوریت کے مستقبل پر بھی سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ پاناما ایک قانونی مسئلہ ہے اس کا جمہوری نظام سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ جمہوریت اور احتساب دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ پاکستان چونکہ ایک پارلیمانی جمہوری نظام والا ملک ہے جہاں آخری فیصلہ فرد واحد کے پاس نہیں یا کسی ایک جماعت کے پاس نہیں بلکہ عوام اور منتخب پارلیمنٹ کے پاس ہونا چاہیے، عوام کے مینڈیٹ کا ہر لحاظ سے احترام ہونا لازمی ہے، اس کے بغیر ملک اور عوام ترقی نہیں کر سکتے۔ مسائل کا حل غیر جمہوری نظام یا اقدام سے نہیں بلکہ پارلیمنٹ کے پاس ہے جو عوام کی نمائندگی کرنے کی پابند ہوتی ہے۔'' (۱۹)

عوامی آواز نے 26 جون 2017 کے اداریہ میں لکھا:

''ملک کی سول سوسائٹی کے نمائندوں نے وفاقی حکومت اور قانون ساز

اداروں کے نمائندگان سے مطالبہ کیا ہے کہ ملک اور وفاق کی مضبوطی کے لیے سب وفاقی یونٹوں کو برابری کی نمائندگی دی جائے۔ اس نمائندگی میں مزدوروں، عورتوں، فن اور ثقافت کی تنظیموں کو بھی شامل کیا جائے تاکہ وہ بھی قانون سازی کے عمل میں حصہ دار بن جائیں۔ 2014 میں پارلیمنٹ کی بنائی ہوئی ''انتخابی مشاورتی کمیٹی'' کی طرف سے طلب کی گئیں تجاویز کو آرٹس کونسل کراچی، پائلر، سندھ لیبر سالیڈیریٹی کمیٹی اور عورت فاؤنڈیشن سمیت مختلف تنظیموں نے ایک چارٹر پیش کیا ہے۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے کہا ہے کہ جس سماج میں ناانصافی ہوگی، برابری کے حقوق لوگوں کو نہیں ملیں گے، مزدور طبقے کو نمائندگی نہیں ملے گی تو وہ معاشرہ ترقی نہیں کر سکے گا۔ ان تجاویز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قومی اسمبلی کی 342 سیٹیں بڑھا کر 500 کی جائیں اور اس تناسب سے صوبوں میں بھی اضافہ کیا جائے۔ پاکستان کے موجودہ انتخابی نظام پر بات کرتے ہوئے سول سوسائٹی کی تنظیموں نے کہا کہ پنجاب اسمبلی کی سیٹیں باقی تین صوبوں کی مجموعی سیٹوں سے زیادہ ہیں اس لیے جمہوریت اور وفاق کے لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور یہ صورتحال وفاق کی روح کے منافی ثابت ہو رہی ہے۔ سول سوسائٹی نے سیاسی جماعتوں پر زور دیا ہے کہ وہ پارٹی کے اندر جمہوریت کے فروغ کے لیے ہر دوسرے سال انتخابات کرائیں۔ سول سوسائٹی نے اس حوالے سے جتنی بھی تجاویز پیش کی ہیں وہ ملک، وفاق اور جمہوریت کی بقاء اور فروغ کے لیے ہیں۔ اگر ان تجاویز پر عمل نہ ہوا تو ظاہر ہے پھر ملک، وفاق اور جمہوریت ہر وقت کمزور حالت میں رہے گی۔'' (۲۰)

ممتاز دانشور اور SZABIST یونیورسٹی کی سوشل سائنس کی فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر ریاض شیخ عوامی آواز کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جنرل ضیاء کی ہلاکت کے بعد ایک نئی جمہوریت کے آغاز کے ساتھ ہی ملک میں صحافت کو بھی کسی حد تک آزادی نصیب ہوئی۔ اس دوران دیگر کئی

اخبارات کے ساتھ عوامی آواز نے بھی 1989 میں اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ عوامی آواز کا اجراء کرنے والے صحافیوں کا تعلق بائیں بازو سے تھا اس لیے پہلے ہی دن سے اس بات کو اخبار کی پالیسی بنایا گیا تھا کہ اخبار ترقی پسند سوچ کو آگے بڑھائے گا۔ اخبار نے ملک میں جمہوری حقوق کی بحالی، صوبوں کے حقوق، مذہبی انتہا پسندی کے خاتمے اور دیگر ایسے موضوعات پر زیادہ توجہ دی۔ اخبار نے ٹریڈ یونین کے مسائل پر بھی لکھا۔ اخبار نے خصوصاً خواتین کے مسائل پر بھی بات کی۔ غیرت کے نام پر قتل اور پسند کی شادی کی حمایت پر لکھا۔ سندھ میں صدیوں سے قائم جاگیردارانہ نظام کے خاتمے، زرعی اصلاحات اور قبائلی جرگوں کے اختیار پر تنقید کی۔ صوبے میں صنعتی نظام کے قیام، آبپاشی کے نظام کو بہتر کرنے جیسے موضوعات پر زور دیا گیا۔ ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے ادبی صفحہ، بچوں کے ایڈیشن اور خواتین کے لیے ہفت روزہ خصوصی شمارہ شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ درحقیقت یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عوامی آواز نے بطور روزنامہ اس وقت کی روایتی سندھی صحافت کو تبدیل کرنے میں بڑا بھرپور کردار ادا کیا اور سندھی صحافت اور سندھی اخبارات میں مزید ترقی پسند سوچ کو آگے بڑھانے کا موقع فراہم کیا''۔(۲۱)

حوالہ جات

۱۔ خٹک، ڈاکٹر عبدالجبار، چیف ایڈیٹر عوامی آواز، ذاتی انٹرویو، کراچی، 13 اگست 2017

۲۔ ایضاً

۳۔ سانگھی، سہیل، سابق ایڈیٹر عوامی آواز، ذاتی انٹرویو، حیدرآباد، یکم اگست 2017

۴۔ خان، توصیف احمد (ڈاکٹر)، آزادئ صحافت کی جدوجہد میں اخباری تنظیموں کا کردار، کراچی پریس کلب

۵۔ خٹک، ڈاکٹر عبدالجبار، چیف ایڈیٹر عوامی آواز، ذاتی انٹرویو، کراچی، یکم اگست 2017

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

۹۔ سانگھی، سہیل، سابق ایڈیٹر عوامی آواز، ذاتی انٹرویو، حیدرآباد، یکم اگست 2017

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ پیرزادہ، زرار، اسسٹنٹ ایڈیٹر عوامی آواز، ذاتی انٹرویو، 6 اگست 2017

۱۳۔ اداریہ عوامی آواز، 29 دسمبر 2007

۱۴۔ اداریہ عوامی آواز، 21 اپریل 2010

۱۵۔ اداریہ عوامی آواز، 28 جنوری 2010

۱۶۔ اداریہ عوامی آواز، 23 جنوری 2010

۱۷۔ اداریہ عوامی آواز، 6 مارچ 2010

۱۸۔ اداریہ عوامی آواز، 20 مئی 2011

۱۹۔ اداریہ عوامی آواز، 3 جولائی 2017

۲۰۔ اداریہ عوامی آواز، 26 جون 2017

۲۱۔ شیخ (ڈاکٹر)، ریاض، ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز، Szabist

آؤٹ لُک

سینئر صحافی اقبال حسین برنی (آئی ایچ برنی) نے 10 نومبر 1962 کو کراچی سے انگریزی ہفت روزہ آؤٹ لُک جاری کیا۔(۱) آئی ایچ برنی صحافیوں کو منظم کرنے کی تحریک کا حصہ تھے۔انہوں نے کراچی کے سینئر صحافیوں کے ساتھ مل کر کراچی پریس کلب قائم کیا اور کراچی پریس کلب کے پہلے سیکریٹری منتخب ہوئے۔(۲)

برنی نے کراچی پریس کلب کا جمہوری آئین تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس آئین پرعملدرآمد کی بناء پر کراچی پریس کلب ملک کا پہلا غیر سرکاری جمہوری ادارہ بن گیا۔کے پی سی نے گذشتہ 70 برسوں کے دوران آزادیٔ صحافت کے تحفظ اور صحافیوں کے حالات کار بہتر بنانے کی تحریکوں کو مضبوط کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔(۳)

برنی نے جب آؤٹ لُک کا اجراء کیا تو صدر جنرل ایوب خان نے مارشل لاء ختم کر کے اپنا آئین نافذ کیا تھا جس میں سارے اختیارات کا منبع صدر مملکت کی ذات تھی۔ایوب حکومت نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے اخبارات پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور ہفت روزہ لیل ونہار پر قبضہ کرلیا تھا اور پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس 1960 کا نفاذ ہو چکا تھا۔اس سیاہ قانون کے ذریعے آزادیٔ صحافت کو محض تصور کی حد تک محدود کردیا گیا تھا۔برنی نے اس پُرآشوب دور میں اپنے ہفت روزہ کے ذریعے حزب اختلاف کی آواز کو توانا کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے مشرقی پاکستان کے عوام کی اپنے حقوق سے متعلق تحریک کی کوریج کی۔(۴)

اس طرح مغربی پاکستان میں ون یونٹ کے خلاف چھوٹے صوبوں کے خدشات سے متعلق آرٹیکلز شائع کیے۔(۵) چنانچہ ان کے ہفت روزہ کے خلاف مقدمات قائم ہونے لگے۔ کبھی ایک پریس نے رسالہ شائع کرنے سے انکار کیا تو کبھی دوسرے پریس نے لیکن برنی نے آؤٹ لُک کی پالیسی تبدیل نہیں کی۔جنرل ایوب خان کی حکومت کی مخالفت کرنے والوں میں مختلف نظریات کے حامل لوگ شامل تھے۔برنی کو ان میں سے بعض گروپوں کی پالیسی سے اتفاق

نہیں تھا مگر اقبال حسین برنی نے ان اخباروں، افراد اور گروہوں کے حق میں بھی جنگ کی۔ وہ فرانس کے عظیم فلسفی والٹیئر کے اس قول ''تم جو کچھ کہہ رہے ہو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے مگر میں مرتے دم تک تمہارے اس حق کا دفاع کروں گا کہ تم اپنی بات بیان کرسکو'' پر مکمل طور پر عمل کیا۔ ایوب حکومت کی سخت پالیسی کی بناء پر یہ دو سال بعد بند ہوگیا۔(٦) جب 1964 میں صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح نے جنرل ایوب خان کو چیلنج کیا تو اقبال حسین برنی فاطمہ جناح کی انتخابی مہم کے چیف پبلک ریلیشنز منیجر مقرر ہوئے۔ ان کی تحریر کردہ تقریریں جب فاطمہ جناح نے عوامی جلسوں میں اپنی آواز میں پڑھیں تو ان کی مہم میں توانائی آ گئی اور بعض تقاریر کا جنرل ایوب اور ان کے وزراء کو جواب دینا مشکل ہوگیا۔(٧)

جنرل ایوب خان کی حکومت کے سیکریٹری اطلاعات الطاف گوہر نے پریس ایڈوائس کے ذریعے اخبارات کو ان تقریروں کی اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور فاطمہ جناح کو انتخابی دھاندلی کے ذریعے شکست دیدی گئی۔ برنی صاحب نے صحافت کو خیر باد کہہ دیا اور ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں چلے گئے۔(٨)

پھر جب پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو نے صدر کا عہدہ سنبھالا تو برنی نے آؤٹ لُک کا دوبارہ اجراء کیا۔ بھٹو اور برنی دونوں ایوب خان کی آمریت کا نشانہ بن چکے تھے اس لیے امید تھی کہ آئی ایچ برنی کو پرسکون ماحول میں آؤٹ لُک شائع کرنے کا موقع ملے گا۔ انہوں نے اپنے اخبار کے افتتاحی شمارے میں لکھا تھا ''نرم ترین الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستقل غیر یقینی کے ان حالات میں اشاعت کے کاروبار سے وابستہ ہونا کوئی خوش کن بات نہیں ہے اس وجہ سے اور بھی زیادہ کہ ہمارے معاشرے کو تاجرانہ اقدار اور کند ذہنی نے لپیٹ میں لے لیا ہے۔ چنانچہ اس نئے جنم کا جواز محض اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی بے اختیار خواہش کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ خصوصیت کسی صحافی کا ایک خاص احساس ذمہ داری ہوتا ہے جو ایک پُرآشوب دن اور سیاہ رات میں محافظ کا فرض ادا کرتا ہے۔(٩)

آؤٹ لُک نے بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت کی برطرفی، بلوچستان میں فوجی آپریشن، کراچی میں سائٹ اور لانڈھی میں مزدور تحریک کے خلاف پولیس آپریشن، سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کی گرفتاریوں، پیپلز پارٹی میں اپنے بانی اراکین معراج محمد خان، رسول بخش

تالپور اور مختار رانا کے خلاف مقدمات اور اخبارات کی بندش، ایڈیٹروں کی گرفتاری کے خلاف صحافیوں کی نمائندہ تنظیم پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اوراس کی ملحقہ تنظیموں کی احتجاجی مہم سے متعلق آرٹیکلز اور اداریہ شائع کیے۔(۱۰)

اگر چہ کہ پیپلز پارٹی کے منشور میں آزادیٔ صحافت کی ضمانت دی گئی تھی اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کو سیاہ قانون قرار دے کر اس کو منسوخ کر کے نیشنل پریس ٹرسٹ (NPT) کو توڑنے کے وعدے کیے تھے مگر وزیر اعظم بھٹو نے اپنی جماعت کے منشور پر عملدرآمد کرنے اور اپنے وعدے پورے کرنے کے بجائے سیاہ قوانین کو اخبارات کی آزادی کو کچلنے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا، یوں 20 جولائی 1974 کو آؤٹ لُک بند کر دیا گیا۔ سینئر صحافی اور محقق ضمیر نیازی نے آؤٹ لُک کا ذکر یوں کیا ہے کہ آؤٹ لُک اختلاف رائے کی ترجمانی کرنے والا ممتاز اور زندہ اخبار تھا جس کی سچائی کی مقدار زیادہ اور ریاکاری کم تھی جو ان دنوں کے اخبارات میں پائی جاتی تھی۔ اسکے یک لخت اور بے وقت بند ہو جانے سے اختلاف کی آواز دفن ہوگئی۔"(۱۱)

سینئر صحافی سعید حسن خان کا کہنا ہے کہ برنی ایک حقیقی جمہوریت پسند اور قوم پرست پاکستانی تھے اور اپنے اس آدرش کی انہوں نے خاصی سزا پائی۔ وہ کہتے ہیں کہ برنی نے 60 کی دہائی میں کئی نوجوانوں کو آؤٹ لُک میں جگہ دی ان میں بنگلہ دیش کے سابق وزیر خارجہ ڈاکٹر کمال حسین، معروف بنگالی دانشور پروفیسر سبحان، پیپلز پارٹی کے رہنما کمال اظفر اور پاکستان ٹیلی وژن کے سابق سربراہ اسلم اظہر قابل ذکر ہیں۔"(۱۲)

سعید حسن خان کا کہنا ہے کہ آؤٹ لُک کی پابندی کے بعد وہ ایک دفعہ ڈھاکہ گئے تو ڈاکٹر کمال حسین نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ فورم کا شمارہ دکھایا اور کہا کہ فورم آؤٹ لُک کی کاپی ہے۔ بھٹو حکومت میں آؤٹ لُک میں لکھنے والوں میں سعید حسن خان اور محمد میاں قابل ذکر تھے۔ برنی اپنے جمہوری روّیے کے باعث پاکستان کے علاوہ بھارت اور یورپ میں بھی مقبول تھے۔ غیر ملکی صحافی عموماً برنی صاحب اور آؤٹ لُک کا حوالہ دیتے تھے۔ آؤٹ لُک نے پاکستان میں جمہوریت کے تصور کو تقویت دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔(۱۳)

حوالہ جات

۱۔ ناز (ڈاکٹر)، احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، صفحہ 235
۲۔ ایضاً
۳۔ عباس مظہر، سابق سیکریٹری کراچی پریس کلب، ذاتی انٹرویو، کراچی، 25 ستمبر 2017
۴۔ خان سعید حسن، سینئر صحافی، ذاتی انٹرویو، کراچی، 25 جولائی 2017
۵۔ ایضاً
۶۔ ناز (ڈاکٹر)، احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، صفحہ 235
۷۔ ایضاً
۸۔ نیازی ضمیر، صحافت پابند سلاسل، پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی یونیورسٹی، صفحہ 200
۹۔ خان سعید حسن، سینئر صحافی، ذاتی انٹرویو، کراچی، 25 جولائی 2017
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ نیازی ضمیر، صحافت پابند سلاسل، پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی یونیورسٹی، صفحہ 201
۱۲۔ خان سعید حسن، سینئر صحافی، ذاتی انٹرویو، کراچی، 25 جولائی 2017
۱۳۔ میاں محمد، سینئر صحافی، ذاتی انٹرویو، کراچی، 7 اکتوبر 2017

مسلم

روزنامہ مسلم 1979ء میں اسلام آباد سے شائع ہوا۔ اس وقت جنرل ضیاء الحق نے پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیدی تھی اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے اپنے مخالف اخبارات پر پابندی عائد کردی تھی۔ مسلم اخبار کے مالک شیعہ عالم آغا مرتضیٰ پویا تھے۔ آغا مرتضیٰ پویا 1977ء میں تحریک استقلال میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کی پہلی حکومت جس کے سربراہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی تحریک میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ آغا مرتضیٰ پویا نے پہلے کراچی سے دو رسائل شائع کیے تھے مگر پھر انہوں نے اپنا کاروبار اسلام آباد منتقل کیا تھا۔ مرتضیٰ پویا نے اسلام آباد سے پہلے اردو کا ہفت روزہ اخبار ملت شائع کیا۔ مستنصر جاوید اس ہفت روزہ ملت کے ایڈیٹر نصرت جاوید، انجم رشید اور انور اقبال شعبہ ادارت میں شامل تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے صاحبزادے اعجاز الحق کی بارات ملتان گئی تھی جہاں ان کی شادی لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اس بارات کو سجانے میں سرکاری دولت کا کھلا استعمال ہوا تھا۔ ہفت روزہ ملت میں اس بارات کی رپورٹنگ پر جنرل ضیاء الحق حکومت اشتعال میں آ گئی تھی۔ خفیہ عسکری ایجنسی کے اہلکار مستنصر جاوید اور نصرت جاوید کی تلاش میں لگ گئے۔ یوں ملت کی اشاعت معطل ہوئی۔ مستنصر جاوید اور نصرت جاوید کچھ عرصے انڈر گراؤنڈ رہے، یوں اس ماحول میں آغا مرتضیٰ پویا نے روزنامہ مسلم کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے معروف صحافی سید نجی اللہ کو اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ نجی اللہ کو جنرل یحییٰ خان کے دور میں سابقہ مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ سے شائع ہونے والے رسالے میں ایک رپورٹ شائع کرنے پر فوجی عدالت نے قید کی سزا دی تھی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے 1972ء میں صدر کا عہدہ سنبھالا تو نجی اللہ کو اپنا

پریس سیکریٹری مقرر کیا تھا مگر نجی اللہ روزنامہ مسلم کی اشاعت سے پہلے انتقال کر گئے۔ پھر پاکستان ٹائمز کے سابق ایڈیٹر اے ٹی چوہدری کو اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اے ٹی چوہدری کا شمار ملک کے معروف ترقی پسند صحافیوں میں ہوتا تھا۔ وہ پی ایف یو جے کے سرگرم کارکن اور پروگریسو پیپرز لمیٹڈ میں مزدور یونین کے بانی صدر رہ چکے تھے۔ مسلم کی انتظامیہ نے پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے سابق نیوز ایڈیٹر سلیم عاصمی کی خدمات حاصل کیں۔ پی ایف یو جے کے رہنما اور مسلم کی ابتدائی ٹیم کے رکن ناصر ملک کا کہنا ہے کہ سلیم عاصمی نے روزنامہ مسلم کی تمام ٹیم کا انتخاب کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند صحافیوں کی ایک ٹیم مسلم میں جمع ہوگئی جن میں احمد حسن، ضیاء الدین، منہاج برنا، سلیم بخاری، ناصر ملک، منور نقوی، ناصر زیدی اور جاوید بخاری وغیرہ شامل تھے۔ معروف صحافی ایاز امیر نے پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ماسکو میں پاکستانی سفارتخانے کے فرسٹ سیکریٹری کی حیثیت سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ انہوں نے بھی صحافت کا آغاز مسلم کی ادارتی ٹیم میں شمولیت سے کیا۔ پھر ہفت روزہ ملت بند ہونے سے بے روزگار ہونے والے نصرت جاوید اور انور اقبال بھی مسلم کی ادارتی ٹیم میں شامل ہوگئے۔ روزنامہ مسلم نے مارشل لاء دور میں آزاد پالیسی کی روش اختیار کی۔ ناصر ملک جو ایڈیٹر اے ٹی چوہدری کے قریبی معاونین میں شامل تھے اپنی یادداشتوں پر زور دیتے ہوئے مسلم کے حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے ٹی چوہدری ایک طاقتور ایڈیٹر تھے۔ وہ وفاقی وزراء سے بات چیت کو پسند نہیں کرتے تھے مگر چوہدری صاحب گرین لائن پر جنرل ضیاء الحق سے رابطہ میں رہتے تھے۔ ناصر ملک کا یہ خیال ہے کہ اے ٹی چوہدری اور جنرل ضیاء الحق میں اس بات پر اتفاق ہوا تھا کہ مسلم خارجہ پالیسی پر تنقیدی رویہ اختیار نہیں کرے گا، یہی وجہ تھی کہ روزنامہ مسلم کا مجموعی رویہ ضیاء الحق حکومت پر تنقیدی تھا۔ ناصر ملک روزنامہ مسلم میں شفٹ انچارج تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ چوہدری صاحب مہینے میں ایک دو دفعہ مجھے بلاتے اور کہتے کہ عرصہ ہوا وزیر اطلاعات راجہ ظفر الحق کی خبر اور تصویر اخبار میں نظر نہیں آئی۔ راجہ ظفر الحق کی خبر اندرونی صفحات میں شائع ہوئی۔ جنرل ضیاء الحق راجہ ظفر الحق کو اپنا اوپننگ بیٹس مین کہتے تھے۔ سلیم عاصمی نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز روزنامہ پاکستان ٹائمز سے کیا تھا۔ وہ

معروف صحافی آئی اے رحمٰن، طاہر مرزا، عزیز صدیقی وغیرہ کے قریبی ساتھیوں میں شامل تھے۔ سلیم عاصمی خبر کی اہمیت اور اس کی پلیسمنٹ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، یوں مسلم ایک نئے لے آؤٹ، خبروں کے جدید اسٹائل اور تصاویر کے خوبصورت ڈسپلے کے ساتھ شائع ہوا۔ ضیاء الدین اقتصادی صحافت کے ماہر ہیں۔ انہوں نے اقتصادی خبروں کے ساتھ تجزیہ تحریر کرنا شروع کیا۔ ضیاء الدین نے ہمیشہ فوجی حکومتوں پر تنقید کی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے ملک کے اقتصادی شعبے کے نگراں غلام اسحٰق کی پالیسیوں پر مسلم میں خاصی تنقید کی جاتی تھی۔ ایاز امیر خوبصورت انگریزی میں اداریے اور کالم تحریر کرتے۔ روزنامہ مسلم میں صحافیوں کی اکثریت کا تعلق بائیں بازو کی ٹریڈ یونین سے تھا۔ یوں مسلم میں مزدور یونین قائم ہوئی۔ مزدور یونین کے قیام کے اجلاس میں اخبار کے ایڈیٹر اے ٹی چوہدری بھی شریک تھے۔ نوجوان ناصر ملک یونین کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ دوسرے صدر ایاز امیر تھے۔ آغا مرتضیٰ پویا نے اپنی کوآپریٹو سوسائٹی کی رقم سے مسلم اخبار کے لیے سرمایہ کاری کی تھی۔ اسی زمانے میں کوآپریٹو سوسائٹیاں بحران کا شکار ہوئیں جس کا اثر مسلم پر بھی پڑا۔ اخبار کے عملے کی تنخواہوں کی ادائیگی میں التواء پیدا ہوا۔ آغا مرتضیٰ پویا نے مسائل کے حل کے بجائے التواء میں ڈالنے کی پالیسی اختیار کی، یوں مسائل بگڑتے چلے گئے۔ اسی دوران آئرلینڈ کی آزادی کی جدوجہد کرنے والے کارکن بابی سینٹ کئی ماہ جیل میں بھوک ہڑتال کے بعد انتقال کر گئے۔ پوری دنیا میں آزادی کی تحریک کی حمایت کرنے والوں نے برطانیہ کی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کے رویہ کی مزمت میں جلسے جلوس منعقد کیے۔ مسلم کی یونین نے اپنے دفتر میں ایک احتجاجی جلسہ کیا۔ اے ٹی چوہدری نے بھی اس جلسہ میں شرکت کی۔ اس تعزیتی جلسہ کی خبر روزنامہ مسلم کے صفحہ اول پر سنگل کالم میں شائع ہوئی۔ یہ پاکستان میں اس موضوع پر پہلا احتجاجی جلسہ تھا۔ اس خبر کو فوجی جنتا کے لیے خطرے کی گھنٹی محسوس کیا گیا۔ اسی دوران انتظامیہ کے رویہ سے دلبرداشتہ ہو کر اے ٹی چوہدری نے استعفیٰ دیا اور اپنے گھر لاہور چلے گئے۔ ناصر ملک کی قیادت میں کارکن لاہور گئے اور چوہدری صاحب کو واپسی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر چوہدری صاحب واپس نہیں آئے۔ مسلم میں تنخواہوں کا بحران بڑھتا چلا گیا۔ مسلم کی یونین نے احتجاج کار

استہ اختیار کیا۔عسکری اسٹیبلشمنٹ نے مسلم کو آزاد صحافت کے حامی صحافیوں سے خارج کرنے کی حکمت عملی تیار کی ہوئی تھی۔ یوں مسلم کی انتظامیہ کے تعاون سے مسلم میں آپریشن ہوا۔ ایاز امیر، ضیا الدین، سلیم عاصمی اور ناصر ملک سمیت بہت سے صحافی برطرف کردیئے گئے۔ پھر ظفر مرزا (زیم)، عارضی ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مسلم کی انتظامیہ نے پنجاب یونیورسٹی سے مستعفی ہونے والے مشاہد حسین کو اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ مشاہد حسین نے آزادانہ پالیسی پر عمل جاری رکھا۔ ان کے دور میں 1983ء میں جنرل ضیاء الحق کے خلاف ایم آر ڈی کی تحریک کو خصوصی کوریج ملی، خاص طور پر مسلم نے سندھ میں ایم آر ڈی کی تحریک میں قوم پرست بائیں بازو کے رہنما رسول بخش پلیجو کی عوامی تحریک کی سرگرمیوں پر خصوصی توجہ دی۔ مشاہد حسین کو بھارت کے صحافی کلدیپ نیئر کے پاکستانی ایٹم بم کے بانی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے انٹرویو کرانے کے قصے میں شامل ہونے پر مستعفی ہونا پڑا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اس انٹرویو میں انکشاف کیا تھا کہ پاکستان نے ایٹم بم تیار کرلیا ہے۔ پھر برطانیہ سے پی ایچ ڈی کرکے انے والی ڈاکٹر ملیحہ لودھی کو ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر ملیحہ لودھی پاکستان کی پہلی خاتون ایڈیٹر تھیں۔ وہ پہلے اخبار کے ادارتی صفحہ پر آرٹیکل تحریر کیا کرتی تھیں۔ مارچ 1988ء میں روزنامہ ڈان کے سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر عابد علی سید کو نیوز ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ جب پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن بے نظیر بھٹو ملک کی پہلی خاتون وزیراعظم بنیں تو ڈاکٹر ملیحہ لودھی نے ایڈیٹر شپ سے استعفیٰ دیدیا۔ انہیں برطانیہ میں ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔ پھر معروف صحافی اے بی ایس جعفری اخبار کے ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جعفری صاحب نے بھی زندگی کا ایک حصہ پاکستان ٹائمز میں گزارا تھا۔ وہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی ساتھی سمجھے جاتے تھے۔ اس دوران انتظامیہ نے سابق سیکریٹری اطلاعات اور روزنامہ ڈان اور برطانیہ سے شائع ہونے والے رسالہ ساؤتھ کے سابق ایڈیٹر الطاف گوہر کو چیف ایڈیٹر مقرر کردیا۔ الطاف گوہر پہلے فوجی آمر جنرل ایوب خان کے دور میں آزادئ صحافت پر پابندیوں کے لیے قانون سازی کے موجد تھے مگر جنرل یحییٰ خان کے دور میں سرکاری ملازمت سے برطرفی کے بعد ان کے خیالات میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ جب پیپلز پارٹی کے پہلے دور حکومت میں الطاف

گوہر کو روز نامہ ڈان کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تو اپنی تحریروں کی بناء پر الطاف گوہر کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ الطاف گوہر کے دور میں بھی روز نامہ مسلم کی آزاد روشن پالیسی برقرار رہی۔ الطاف گوہر اور اے بی ایس جعفری مسلم کی انتظامیہ کی پالیسی کی بناء پر مستعفی ہو گئے اور سینئر صحافی سلامت علی ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ سلامت علی ایک خاصے عرصے تک روز نامہ پاکستان ٹائمز سے وابستہ رہے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں وہ ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے رسالہ فار ایسٹرن اکنامک ریویو کے پاکستان میں نمائندے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت سلامت علی کی رپورٹوں سے سخت ناراض تھی۔ سلامت علی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ایک فوجی عدالت نے انہیں قید و کوڑوں کی سزا دی تھی مگر سلامت علی کے عزم میں کمی نہیں آئی تھی مگر اخبار کے مالیاتی حالات میں مسلسل ابتری کی بناء پر سلامت علی بھی مستعفی ہو گئے اور عبدالمالک اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مگر وہ 6 مہینے تک ہی ایڈیٹر رہے۔ اس دوران اخبار کا مالیاتی بحران شدید ہوا۔ صحافیوں اور دیگر عملے کو تنخواہیں نہیں ملیں، یوں اخبار بند ہو گیا۔ روز نامہ مسلم سے سینئر صحافی فرہاد زیدی بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے اخبار کے شعبہ اشتہارات کی نگرانی کی اور شعبہ ادارت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ معروف کمیونسٹ دانشور ایرک سپرین نے روز نامہ مسلم کے میگزین ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ اسی طرح خواجہ آصف، غنی جعفر اور حمید اختر بھی روز نامہ مسلم سے منسلک رہے۔ روز نامہ مسلم سے وابستہ رہنے والے معمر صحافی شاہد حسین کا کہنا ہے کہ مسلم کی تباہی کی ذمہ داری آغا مرتضیٰ پویا کے صاحبزادے پر عائد ہوتی ہے جو بعض دیگر مشاغل کی بناء پر اخبار کی نگہبانی کا فریضہ انجام نہ دے سکے۔ روز نامہ مسلم 1988ء میں بند ہو گیا۔ روز نامہ مسلم کے بند ہونے سے نہ صرف صحافت بلکہ روشن خیالی اور عوام کے حقوق کے ایجنڈا کو سر بلند کرنے والی صحافتی تحریک کو بھی دھچکا لگا۔

حوالہ جات

۱۔ ملک، ناصر، سابق ایڈیشن انچارج روز نامہ مسلم، ذاتی انٹرویو، کراچی، 15 دسمبر 2018ء

۲۔ سید عابد علی، سابق نیوز ز ایڈیٹر روز نامہ مسلم، ذاتی انٹرویو، کراچی، 18 دسمبر 2018ء

پنجاب پنچ

جب حسین نقی پنجاب ٹائمز سے رخصت کر دیئے گئے تو انہوں نے ایک اور ہفت روزہ پنجاب پنچ جاری کیا۔ اس ہفت روزہ کے پہلے ایڈیٹر پرویز طاہر تھے جو بعد میں معروف ماہر اقتصادیات کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ پنجاب پنچ کی ٹیم میں وہی لوگ شامل تھے جنہوں نے نقی صاحب کے ساتھ پنجاب ٹائمز میں کام کیا تھا۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اس ہفت روزہ میں لکھنا شروع کیا جن میں خالد حسین، جسٹس ایس اے سلام، نجم الحسن، مظفر قادر، پروفیسر ایرک سیرین اور مشرقی پاکستان کے صحافی شامل تھے۔ (1) رسالے کے لیے ابتدائی طور پر سرمایہ خدیجہ گوہر نے فراہم کیا۔ منظور قادر ہفت روزہ پنجاب پنچ کے پرنٹر تھے۔ پنجاب پنچ پیک آل پرنٹرز (Pack PrintersAll) میں شائع ہوتا تھا۔ یہ پرنٹنگ پریس منظور قادر کے خاندان کی ملکیت تھا۔ (2)

ہفت روزہ کے پہلے ایڈیٹر نعیم طاہر نے استعفیٰ دیدیا تو حسین نقی نے ایڈیٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ حسین نقی کا کہنا ہے کہ نعیم طاہر نے اپنے والد کے دباؤ پر استعفیٰ دیا۔ پنجاب پنچ ترقی پسندانہ سوچ کی ترویج کرتا تھا۔ یوں یہ پیپلز پارٹی کا حامی تھا مگر جب پنجاب پنچ شائع ہونا شروع ہوا تو سیاسی منظر نامے پر اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ملک کے صدر جنرل یحییٰ خان نے منتخب اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا تھا مگر جنرل یحییٰ خان پیپلز پارٹی کے چیئرمین اور مشرقی پاکستان سے قطعی اکثریت حاصل کرنے والے قومی اسمبلی کی سب سے بڑی جماعت عوامی لیگ میں آئین کے بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہوا تھا۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے ڈھاکہ میں ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور جنرل یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا تھا۔ اس فیصلے کو عوامی لیگ نے ماننے سے انکار کرتے ہوئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ فوج نے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی تحریک کو کچلنے کے لیے بنگالی عوام کی نسل کشی

شروع کی تھی۔ پنجاب پنچ نے پیپلز پارٹی کی اس پالیسی پر شدید تنقید کی تھی۔ پھر 16 دسمبر 1977ء کو پاکستان کی فوج کے مشرقی پاکستان کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل اے کے نیازی نے ریس کورس گراؤنڈ ڈھاکہ میں بھارتی کمانڈر جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور 90 ہزار فوجی بھارت کی قید میں چلے گئے تھے۔[3] پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے 20 دسمبر 1971ء کو سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور ملک کے صدر کے فرائض سنبھال لیے اور ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ پنجاب پنچ نے پیپلز پارٹی کی حکومت پر تنقید کا سلسلہ جاری رکھا۔ سینئر صحافی خالد حسین نے لکھا ہے کہ جب پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی کی ایک نشست سے خطاب کیا تو اس نشست میں بھٹو کے پرانے دوست اور ہمدرد حسین نقی نے بھٹو صاحب سے سوال کیا کہ انہوں نے سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ کیوں قبول کیا؟ بھٹو نے حسین نقی کو یہ کہہ کر خاموش کرا دیا کہ تم اتنے عرصے تک مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کو برداشت کرتے رہے ہو تو تبدیلی کی خاطر سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو برداشت کرنے میں کیا حرج ہے؟[4] 18 مارچ 1972ء کو حسین نقی کو سابق سیاست دان اور سینئر صحافی پیر علی محمد راشدی کی سربراہی میں قائم 26 رکنی پریس ایڈوائزری کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر پنجاب پنچ میں شائع ہونے والے مواد کے بارے میں وضاحت کے لیے کہا گیا۔ حسین نقی نے پیر علی محمد راشدی کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے سے انکار کیا۔[5] 23 مارچ 1972ء کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون بی اور گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر نے پنجاب پنچ پر پابندی لگا دی اور حسین نقی اور پنجاب پنچ کے ناشر مظفر قادر کو مارشل لاء ریگولیشن 89 اور 6(A) کے تحت گرفتار کر لیا گیا جس کے بعد خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ فوجی عدالت نے حسین نقی اور مظفر قادر کو ایک ایک سال قید اور دو دو لاکھ روپے جرمانے کی سزا دی۔ صحافیوں کی تنظیم پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے حسین نقی اور دیگر صحافیوں کی رہائی کے لیے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ ملک میں اپریل 1972ء کو عبوری آئین نافذ ہوا اور مارشل لاء ختم ہوگیا۔ 27 جون 1972ء حسین نقی اور دیگر صحافیوں کو رہا کر دیا گیا مگر پنجاب پنچ پھر شائع نہ ہوا۔[6]

حوالہ جات

۱۔ ناز، ڈاکٹر احسن اختر، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور، جنوری 2002ء، صفحہ نمبر 191

۲۔ ایضاً

۳۔ روزنامہ ڈان، 16 دسمبر 1971ء

۴۔ حسین نقی، سابق ایڈیٹر ہفت روزہ پنجاب پنچ، لاہور، ذاتی انٹرویو

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

پنجاب ٹائمز

سینئر صحافی حسین نقی خبر رساں نیوز ایجنسی پاکستان پریس انٹرنیشنل (P.P.I) کے لاہور کے بیورو چیف تھے۔ انہیں 1969ء میں جماعت اسلامی کے دباؤ پر پی پی آئی سے نکال دیا گیا۔ حسین نقی کا کہنا ہے کہ معروف ادیب اور صحافی صفدر میر نے انہیں یہ پیشکش کی کہ وہ انگریزی کے ہفت روزہ پنجاب ٹائمز کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیں، یوں حسین نقی ہفت روزہ پنجاب ٹائمز کے ایڈیٹر ہوگئے۔ اس ہفت روزہ کے پبلشر اعظم سہروردی تھے، یوں 11 جنوری 1970ء کو یہ ہفت روزہ کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ حسین نقی نے پاکستان ٹائمز سے تعلق رکھنے والے زیڈ آئی مرزا (Z.I.M)، پی پی آئی سے تعلق رکھنے والے مسعود خان، سول اینڈ ملٹری گزٹ سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ریاض، خدیجہ مستور، صفدر میر، نجم حسین، سید طاہر محمد خان، اشفاق بخاری اور عبدالولی خان وغیرہ کو ہفت روزہ میں جذوی طور پر کام کرنے اور آرٹیکل لکھنے کے لیے مدعو کیا۔ یوں پنجاب ٹائمز شروع سے ترقی پسند نظریات کا علمبردار بن گیا۔ (1)

پھر اس ہفت روزہ کو پیپلز پارٹی کی رکن قومی اسمبلی بیگم نسیم اکبر خان نے خرید لیا اور حسین نقی اور دیگر صحافیوں کی ملازمتیں ختم کردی گئیں۔ حسین نقی نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ بیگم نسیم اکبر خان نے یہ اقدام پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی ایماء پر اُٹھایا۔ ہفت روزہ پنجاب ٹائمز پیپلز پارٹی کی ترقی پسندانہ پالیسیوں اور اس کے منشور کی بناء پر حمایت کرتا تھا مگر جب پیپلز پارٹی نے 1970ء کے انتخابات میں جاگیرداروں کو ٹکٹ دیئے تو پنجاب ٹائمز کے اداریوں اور تجزیوں میں ان فیصلوں پر شدید تنقید کی گئی۔ شاید یہی وجوہات تھیں کہ حسین نقی نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ہفت روزہ پنجاب ٹائمز کی نئی پبلشر نے ایڈیٹر سمیت تمام صحافیوں کو ملازمتوں سے

برطرف کردیا۔(2)

حسین نقی نے انٹرویو میں بتایا کہ مسعود ابھی میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ظفر اقبال مرزا بھی تھے جو بڑی اچھی اور دلچسپ سرخیاں نکالتے تھے۔(3)

اس ہفت روزہ کے پہلے اداریے میں اس کے مقاصد "We Shall fight" کے عنوان بیان کیے گئے۔اس میں وقت کی ملکی،سیاسی اور اقتصادی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا گیا کہ:

"This means rearranging our socio-economic set-up on a socialisticpattern".

اس میں ملک کے اقتصادی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے تجاویز بھی دی گئیں۔ جاگیرداری کو ہماری اقتصادی اور معاشرتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے ہوئے لکھا گیا کہ:

"Fordemolishingfeudalism,weinitiallyfavourtakingoverthe ownership of land from all those who do not physicilly participate in the process of tilling and yet harvest much beyond their prorotion in investment of any kind in the filed of agriculture..."

صنعت وحرفت کا ذکر کرتے ہوئے سرمایہ دار کو صارف کو لوٹنے اور مزدور کا استحصال کرنے والا قرار دیتے ہوئے لکھا گیا کہ:

"We strongly stand for unhindered right of strike for workers solingasprivateownershipofindustryallowed..."

اپنے ملک کی علاقائی سلامتی وتحفظ کے علاوہ ثقافتی یک جہتی کا ذکر کیا گیا۔تعلیم اور سرکاری کاموں میں اپنی مادری زبانیں استعمال کرنے کی بات کی گئی۔ پنجاب،سندھی، پشتو اور بلوچی کو قومی زبانیں قرار دیا گیا۔ پاکستان کے کسی بھی علاقے میں رہنے والوں کو اپنی مرضی سے اپنے علاقے کو کوئی بھی نام دینے کی حمایت کی گئی اور سبھی کو پاکستانی قرار دیا گیا۔

مذہبی اجارہ داری کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا گیا کہ:

" We also disapprove that Pakistan should be turned into a thecocracy and regard such efforts by a section of self-proclaimed "thekedars" of our great religion, Islam, as contraytoourideologyasen-unciatedbytheFatherofNation Quaid-e-AzamMuhammadAliJinnah.

We declare that we shall confront and fight these old anti-Pakistanelementsinthegreattraditionofthe Quaid and AllamaIqbalandinshaAllah,weshallwin."

اس اداریے کے مندرجات میں سوشلسٹ نظریات کے مطابق ملک کے اقتصادی نظام کو انہی خطوط پر استوار کرنے، جاگیرداری کے خاتمے اور سرمایہ داری کی مخالفت وغیرہ مارکس کے صحافتی نظریات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ (4)

اس اداریے میں ترقی پسندوں کی پاکستان میں مخصوص حکمت عملی یعنی ثقافت اور زبان کی حمایت اور علاقائیت کے فروغ کے علاوہ سب سے زیادہ مخالف ملائیت (Theocracy) کی کی گئی اور مذہبی طبقات کے خلاف لڑنے کا برملا اعلان کیا گیا۔ لہٰذا اپنی پالیسی اور مقاصد کے حوالے سے یہ خالصتاً اشتراکی نظریات کا حامل ترقی پسند انگریزی ہفت روزہ تھا۔

پنجاب ٹائمز کے ایڈیٹر سے دستیاب شدہ پرچوں کے مندرجات کا مختصر جائزہ لینے سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

1۔ اس کے ابتدائی اداریے کے مطابق اس پرچے میں ملک کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات کی خبریں اور تجزیے سوشلسٹ اور ترقی پسند نظریات کی روشنی میں کیے گئے۔

2۔ جاگیردار اور سرمایہ دار سیاست دانوں اور طبقوں پر کڑی تنقید کی گئی۔ (5) پنجاب ٹائمز نے مختصر عرصے کے دوران رائے عامہ کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا۔

حوالہ جات

۱۔ ناز، ڈاکٹر احسن، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ نمبر 191

۲۔ نقی حسین، ذاتی انٹرویو، لاہور، 15 جولائی 2017ء

۳۔ ایضاً

۴۔ ناز، ڈاکٹر احسن، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک لاہور، صفحہ نمبر 191

۵۔ ایضاً

انٹرویوز

۱۔ آئی اے رحمٰن، سابق چیف ایڈیٹر روزنامہ پاکستان ٹائمز
۲۔ مسعود اشعر، سابق چیف ایڈیٹر روزنامہ امروز
۳۔ حسین نقی، سابق ایڈیٹر پنجاب پنچ
۴۔ محمد ضیاء الدین، سابق ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ ڈان، اسلام آباد
۵۔ ناصر زیدی، رکن فیڈرل ایگزیکٹو کونسل پاکستان یونین آف جرنلسٹس
۶۔ فریدہ حفیظ، سابق رہنما پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس
۷۔ وہاب صدیقی، سابق ایڈیٹر ہفت روزہ الفتح
۸۔ عابد علی سید، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ ڈان
۹۔ ڈاکٹر جبار خٹک، چیف ایڈیٹر روزنامہ عوامی آواز
۱۰۔ بدر عالم، ایڈیٹر ماہنامہ ہیرالڈ
۱۱۔ پروفیسر امین مغل، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر ہفت روزہ ویو پوائنٹ
۱۲۔ رشید بٹ، سابق سب ایڈیٹر روزنامہ آزاد، روزنامہ مساوات
۱۳۔ طاہر نجمی، ایڈیٹر روزنامہ ایکسپریس، کراچی
۱۴۔ سعید حسن خان، سینئر صحافی

کتابیات

۱۔ احمد سلیم، موج زر نگارشات، لاہور
۲۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، پاکستان میں ترقی پسند صحافت، کلاسک، لاہور
۳۔ سید سبط حسن، پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل، مکتبہء دانیال
۴۔ عبدالرؤف ملک، سرخ سیاست، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور
۵۔ ضمیر نیازی، صحافت پابند سلاسل، ترجمہ اجمل کمال، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی
۶۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، فیض احمد فیض، درد اور درماں کا شاعر، پیس پبلیکیشنز، لاہور
۷۔ ڈاکٹر میمونہ سبحانی، ہم سفیرانِ فیض، شمع بکس، فیصل آباد

۸۔ ڈاکٹر ایوب مرزا، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، شیریں گل، لاہور
۹۔ راشد اشرف، چراغ حسن حسرت، بزم تخلیق ادب، کراچی
۱۰۔ عبدالرؤف ملک، فیض شناسی، پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی
۱۱۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، ترقی پسند تحریک وصحافت۔ مکالمات، القمر انٹر پرائز، لاہور
۱۲۔ ڈاکٹر توصیف احمد خان، آزادیٔ صحافت کی جدوجہد میں اخباری تنظیموں کا کردار
۱۳۔ عبداللہ ملک، سوانح میاں افتخارالدین، کوثر پبلشرز، گارڈن ٹاؤن، لاہور
۱۵۔ ڈاکٹر طاہر مسعود (ایڈیٹر)، ابلاغیات شعبہ ابلاغ عامہ، جامعہ کراچی
۱۶۔ ڈاکٹر طاہر مسعود، صحافت انیسویں صدی میں، فضلی سنز، کراچی
۱۷۔ سید سبط حسن (مرتب سید جعفر احمد)، افکار تازہ، مکتبہء دانیال، کراچی
۱۸۔ ڈاکٹر مہدی حسن، صحافت، اعتصام پبلشرز، لاہور
۱۹۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بگھیو، سندھی صحافت جوارتقاء، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، سندھ یونیورسٹی
۲۰۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد، جنوں میں جو بھی گزری: ایک صحافی اور شاعر کے تجربات ومشاہدات، حسن عابدی، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی
۲۱۔ Humaira M. Khan, Maryam Murtaza, Sadriwala, Dawn The History, Department of Mass Communication, University of Karachi
۲۲۔ سیدہ برجیس بانو، فیض احمد فیض کی اردو صحافت، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی
۲۳۔ Asharani Mathur, The Indian Media, Rmza Co. New Delhi
۲۴۔ Irfan Waheed Usmani, Print Culture and Left Wing Radicalism in Lahore, Pakistan, 1947 - 1971
۲۵۔ Mahmood Shaam, Indifference in the times of Extremism, Paramount Books Ltd., Karachi
۲۶۔ Inamur Rehman, Public Opinion & Political Development in Pakistan, Oxford University Press, Karachi

پاکستان میں صحافت کی متبادل تاریخ

ڈاکٹر توصیف احمد خان

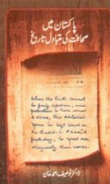


”جیسا کہ سیاست بتدریج میڈیا کے زیر اثر ہوتی جا رہی ہے،
اب سوال میڈیا کو سیاست اور سماج سے آزاد کرانے کا نہیں،
بلکہ اہم سوال سیاست اور سماج کی میڈیا سے آزادی ہے“



رچرڈ سٹروم بیک

(سابق چیف ایگزیکٹو آفیسر اور صدر ویب گروپ)







بدلتی دنیا پبلیکیشنز، اسلام آباد
0333-5577993
Badaltidunyapublication@gmail.com



978-969-7753-17-8

DUNYA PUBLICATIONS

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندڙ نسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنی e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌائڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) کـا بـہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جـو کـو بـہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نـہ آهي. جيکڏهن کو بـہ شخص اهـڙي دعوىٰ کـري ٿـو تـہ پَـکَ ڄاڻو تـہ اُهو کُـوڙو آهي. نـہ ئـي وري پَـنَ جي نالي کـي پئسا گڏ کـيا ويندا. جيـکڏهن کـو اهـڙي ڪوشش ڪري ٿـو تـہ پَکَ ڄاڻو تـہ اُهو بِہ کُوڙو آهي.

جَهـڙيءَ طَرَح وڻـن جا پَـنَ ساوا، ڳاڙها، نيـرا، پيـلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بـہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرنـدڙ ۽ پڙهنـدڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهنـدڙ بـہ ٿـي سگهن ٿـا. پيـن لفظن ۾ پَنَ کا خُصوصي ۽ تالي لڳل کِلَب Exclusive Club نـہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تـہ پَـنَ جا سڀ ڪَـم ڪـار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پـر ممکـن آهي تـہ ڪـي ڪـم اُجرتـي بنيـادن تـي بـہ ٿِيـن. اهـڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَبِئي جي مدد ڪَـرڻ جـي اُصـولَ هيـٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجـارتي non-commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن کـي ڊِجيِٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪـو بـہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪـرڻ جي ڪوشش نـہ ڪـئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ کان پـو ٻيـو اهـم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيـکڏهن ڪـو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تـہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بـہ لاڳاپو نـہ هوندو.

پَنَن کي ڪُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکَڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻ، سمجھَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ باروڊَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجھہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن:
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ-

اِن حسابَ سان اٽڃاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۾ سماجي حالتن تان نظر کڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اٽڃاٽن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽَر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

ون ون کي مون پاڪِي پائي چيو تہ "منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ".
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)